آسان عقائد

(عقل، آیاتِ قرآنی اور مستند روایات کی روشنی میں)

جلد اوّل

دارالثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

(عقل، آیاتِ قرآنی اور مستند روایات کی روشنی میں)

تالیف

مجلس مصنّفین

ترجمہ

ثقۃ الاسلام شیخ محمد فاضل

یکے از مطبوعات

دارالثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - جے - ۵/۴ ـــــ ناظم آباد ـــ نمبر ۲ ـــ کراچی

نام کتاب : ـــــــــــ آسان عقائد (جلد اوّل)

تالیف : ـــــ مجلس مصنفین ہیئت عقیدتی سیاسی ارتش جمہوری اسلامی ایران

ترجمہ : ـــــــــــ حجۃ الاسلام محمد علی فاضل

کتابت : ـــــــــــ سید جعفر صادق

تصحیح و تزئین : ـــــــــــ سید سعید حیدر زیدی

ناشر : ـــــــــــ دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

تعاون : ـــــــــــ سازمان تبلیغات اسلامی ایران

طبع اوّل : ـــــــــــ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ دسمبر ۱۹۸۸ء

تعداد : ـــــــــــ ۲۰۰۰

طبع دوم : ـــــــــــ ربیع الاوّل ۱۴۱۲ھ اکتوبر ۱۹۹۱ء

تعداد : ـــــــــــ ۲۰۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم
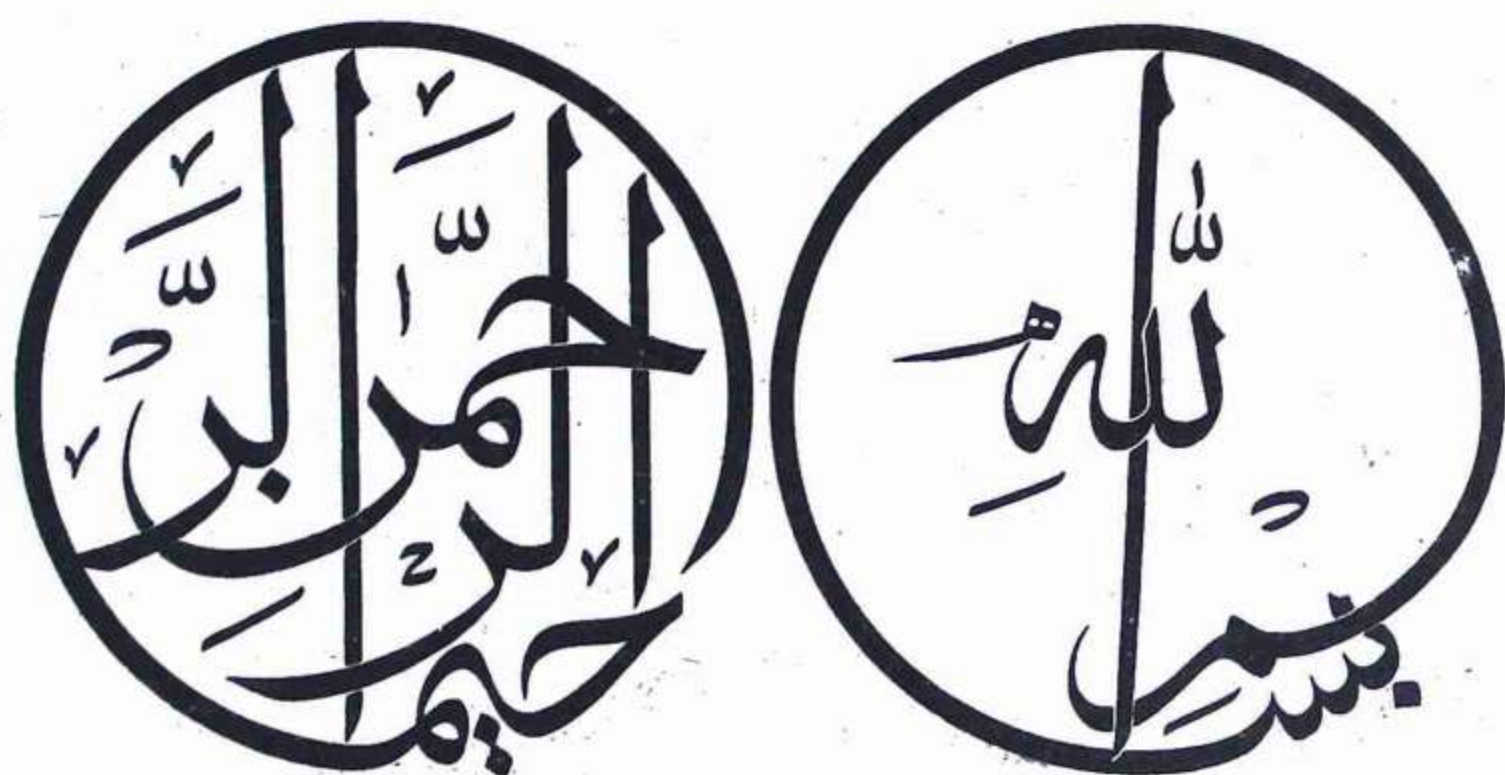
پیش لفظ

اسلام جذبات کی گہرائی وگیرائی کا سرچشمہ عقیدے کو قرار دیتا ہے، اسلامی تعلیمات کی روسے جذبات کی قدر وقیمت اور ان کی پختگی کا دار و مدار عقیدے پر کامل یقین اور اس کی عمق و گہرائی پر ہے۔ یعنی جس قدر عقیدہ راسخ ہوگا اور انسان بے کھٹک عقیدے پر یقین رکھتا ہوگا اسی قدر اس کے جذبات پاکیزہ، گہرے، شدید اور دیرپا ہوں گے اور جس قدر انسان کا عقیدہ کمزور ہوگا اسی قدر اس کے جذبات واحساسات سطحی اور ہر لمحہ تغیر پذیر ہوں گے۔

اس کلیہ اور فلسفہ کو قرآن کریم نہایت ہی دلفریب پیرائے میں یوں بیان کرتا ہے:

"کہہ دیجیے، اگر تمھارے باپ دادا، بیٹے پوتے، بھائی بیویاں، قوم قبیلہ، جمع کیا ہوا مال، وہ تجارت جس کے

گھاٹے سے ڈرتے ہو اور منزل و مکان تمھیں اللہ،
اس کے رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ
محبوب ہیں تو اللہ کا حکم آنے تک ٹھہرو، اللہ فاسق
قوم کی رہنمائی نہیں کرتا۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۲۴)

اس آیت میں ماں باپ، اولاد اقربا اور مال و دولت جیسی محبّتوں کو جذبات سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ایسے شدید جذبات ہیں جو دوسرے تمام جذبات کو سرد کر دیتے ہیں مگر وہ جذبہ جو صحیح عقیدہ و فکر پر استوار ہو وہ ان شدید ترین جذبات کو بھی سرد کر دیتا ہے اور ان محبتوں اور جذبات کو قربان کر کے یہ عقیدہ و ایمان مزید مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ جناب امیرؑ فرماتے ہیں:

"ہم لوگ، رسولؐ کے ساتھ ہو کر اپنے باپ، بیٹوں،
بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے تھے اس سے ہمارا
ایمان بڑھتا تھا، اطاعت اور راہِ حق کی پیروی میں
اضافہ ہوتا تھا اور کرب و الم کی سوزشوں پر صبر میں
زیادتی ہوتی تھی اور دشمنوں سے جہاد کرنے کی کوشش
بڑھ جاتی تھی۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۵۶)

مندرجہ بالا سطور سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا درست نہیں کہ جذبات کسی قسم کی قدر و قیمت اور ارزش نہیں رکھتے لیکن یہ ضرور ہے کہ جذبات بغیر عقیدے کے اس قدر موثر نہیں۔

اسی طرح جذبات سے عاری بے رنگ عقیدہ بھی اسلامی تعلیمات کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اسلام دراصل اپنے ماننے والوں سے چاہتا ہے کہ عقائد کو عقلی دلائل اور عقل و منطق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اس طرح دل سے قبول کریں کہ یہ قبولیت ان کی فکر و عمل میں ایک ہیجان پیدا کر دے اور وہ پختہ عقیدے اور گہرے جذبات کے ساتھ میدانِ عمل میں وارد ہوں۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ رب العزت ہے۔

"کیا ابھی تک اہل ایمان کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ
ان کے دل ذکر خدا اور جو حق باتیں اس نے اتاری ہیں ان
کے لیے نرم ہوں، پہلے والوں کی طرح نہ ہوں کہ انھیں
کتاب دی گئی تھی ان کی مدت بہت دراز ہوئی، ان کے
دل سخت ہوئے اور ان میں سے اکثر لوگ تو فاسق تھے"!

(الحدید ۱۶)

اس آیت کی رو سے خداوند عالم اہل ایمان سے ایمان و عقیدہ کی پختگی کے بعد رقت و نرمیٔ قلب کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ ایمان و عقیدہ کے ساتھ ساتھ مومنوں میں غیرت و حمیت دینی بھی پیدا ہو اور کسی حالت میں بھی وہ شعائرِ اسلامی کی پائمالی اور احکامِ اسلامی کی مخالفت برداشت نہ کریں۔

ہم اگر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیں اور اس سے پہلے خود اپنے احساسات و جذبات کا جائزہ لیں تو بخوبی اندازہ ہوگا کہ ہم دینی عقائد پر یقین اور ایمان کامل کا دم تو بھرتے ہیں لیکن ہم نے ان عقائد و احکام کو پوری طرح اپنے قلب و روح میں جذب نہیں کیا۔

اسی لیے ہم زبانی طور پر تو توحید الٰہی کے قائل ہیں اور اسے اپنے عقائد میں سرفہرست قرار دیتے ہیں لیکن ہم نے توحید عملی کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور ہمارے جذبات و کیفیات اس عقیدہ سے ہم آہنگ نہیں۔ اس لیے ہمارا عمل توحید عملی کے عقیدہ

سے متضاد ہے۔

ہم اپنے اقتصادی، سماجی، سیاسی، اجتماعی، معاشی اور معاشرتی امور میں غیرِ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ گویا ان امور میں ہم آزاد ہیں کہ جس کی چاہیں پیروی کریں، بالفاظ دیگر ہم ان امور میں خدا کے شریک ٹھہرائیں۔

ہم عقیدۂ عدلِ الٰہی کے قائل تو ہیں اور اس پر نہایت سرگرمی سے سیر حاصل بحث تو کرتے ہیں لیکن خداوندِ عالم کے عدالتِ اجتماعی پر مبنی عطا کردہ قوانین و احکام کے پابند نہیں۔

عقیدۂ نبوّت کو دل سے قبول تو کرتے ہیں لیکن مقصدِ انبیاء یعنی لوگوں کو ذلّت و بدبختی سے نجات دلانا، اور پیغامِ انبیاء کو ہم نے طاق نسیاں کی زینت بنا رکھا ہے۔

مسئلہ امامت کے بھی ہم قائل ہیں اور امام کے معصوم ہونے، عادل ہونے، ہر قسم کے سہو و نسیان سے مبرّا ہونے اور عالم ہونے پر ہم سینکڑوں دلائل رکھتے ہیں لیکن جب ہم عملی طور پر اپنے رہبروں کا انتخاب کرتے ہیں تو ان تمام خصوصیات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور فقط ذاتی منافع اور محدود فوائد کے میزان پر رہبریت کو پرکھتے ہیں۔

قیامت اور روزِ جزا کے عقلاً تو ہم قائل ہیں لیکن اس جذبہ نے ہمارے دل میں کتنی جگہ پائی ہے یہ ہماری روزمرّہ زندگی سے ہویدا ہے۔

ہم میں روزِ جزا کی جوابدہی کا کسقدر احساس ہے اس کی وضاحت ہمارے روزانہ کے معمولات کرتے ہیں۔

عرصۂ دراز سے کسی ایسی کتاب کی تلاش تھی جو نوجوانوں کے لیے اسلامی عقائد

نصابی صورت میں اور عقلی و علمی دلائل کے ساتھ بیان کرے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے سوالات کے جواب بھی فراہم کرے جو عموماً نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ایسے شکوک و شبہات بھی رفع کرے جو لادینی افکار کے حامل افراد ان کے ذہنوں میں پیدا کرتے ہیں۔

ہم سازمان تبلیغات اسلامی ایران کے شعبہ اردو کے مسئول حجۃ الاسلام سید مقصود رضوی کے ممنون و مشکور ہیں کہ انھوں نے اس سلسلہ میں ہماری مدد فرمائی اور کتاب ہذا کا ترجمہ مرحمت فرمایا۔

کتاب کا فارسی متن "ہیئت عقیدتی سیاسی ارتش جمہوری اسلامی ایران" کا تیار کردہ ہے۔ جسے جیّد علماء اور دانشوروں کے مختلف شہ پاروں سے اکٹھا کیا گیا ہے۔

ہم اس بات کے مدعی نہیں کہ یہاں تمام شکوک و شبہات کو رفع کر دیا گیا ہے لیکن بہرحال ایک ابتدائی پیشکش کے حوالہ سے بڑی حد تک سوالات کے جواب اور اشکالات رفع کیے گئے ہیں۔

امید ہے کتاب نوجوانوں کے دینی حلقوں سے سند قبولیت پائے گی۔

"ناشر"

"کہو اللہ یکتا ہے،

وہ بے نیاز ہے

اور سب اس کے محتاج ہیں۔

نہ اس نے کسی کو جنا ہے

نہ اس کو کسی نے جنا،

اور اس کا کوئی مانند نہیں"

"سورۂ اخلاص"

توحید

فہرست اسباق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا سبق

خُداجوئی

اس جہان کے پیدا کرنے والے کے بارے میں ہم کس لیے سوچتے ہیں؟

۱۔ روح کی تشنگی اور مادۂ جستجو

عالمِ ہستی کے بارے میں آگاہی اور آشنائی پیدا کرنا ہم سب کی دلی خواہش ہے۔ ہم سب یہ جاننا چاہتے ہیں کہ :

یہ بلند و بالا آسمان اپنے ستاروں سمیت ،

یہ چوڑی چکلی زمین اپنے تمام دلفریب مناظر سمیت ،

یہ رنگ برنگی مخلوقات ، خوبصورت پرندے ، سمندر میں مختلف قسم کی مچھلیاں ، پھول اور شگوفے ، فلک بوس درختوں کی مختلف اقسام ، غرضیکہ

یہ پوری کائنات خود بخود وجود میں آئی ہے یا کوئی ماہر اور توانا ہاتھ اسے معرض وجود میں لایا ہے ؟

ان سب سے ہٹ کر سب سے پہلا سوال جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ :

ہم کہاں سے آئے ؟

کہاں ہیں ؟

اور کہاں جائیں گے ؟

اگر ہم ان تین سوالوں کا صحیح جواب پالیں تو یہ ہمارے لیے کس قدر خوش بختی کی بات ہوگی ؟ یعنی اگر ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ ہماری زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا ؟ اس کا انجام کیا ہوگا ؟ اور اس وقت ہمارا کیا فریضہ ہے ؟

جستجو اور تلاش کا مادہ ہمیں کہتا ہے کہ جب تک ان سوالات کے جواب نہ پالیں آرام سے نہ بیٹھیں ۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ٹریفک کے حادثے میں کوئی شخص مجروح اور بے ہوش ہو جاتا ہے ۔ معالجے کے لیے اسے ہسپتال لے آتے ہیں ۔ جب اسے غشی سے تھوڑا سا افاقہ ہوتا ہے اور وہ ہوش میں آتا ہے تو اپنے اطراف والوں سے سب سے پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ یہ کونسی جگہ ہے ؟ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے ؟ اور کب میں یہاں سے جاؤں گا ؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے سوالات کے بارے میں انسان خاموش نہیں رہ سکتا ۔

یعنی سب سے پہلی چیز جو ہمیں خدا کی تلاش اور عالمین کے پیدا کرنے والے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے وہ رُوح کی تشنگی اور مادہ جستجو ہے ۔

۲۔ شکر گزاری کا احساس

چند لمحے کے لیے سوچیے کہ آپ کو کسی دعوت میں مدعو کیا گیا ہے۔ آپ کے آرام کے لیے تمام وسائل مہیا کیے گئے ہیں لیکن چونکہ آپ کو اپنے بڑے بھائی کے توسط سے مدعو کیا گیا ہے لہٰذا آپ اپنے میزبان کو اچھی طرح نہیں پہچانتے۔ بلاشبہ مجلسِ دعوت میں پہنچتے ہی آپ اپنے میزبان کو پہچاننے کی کوشش کریں گے اور اس کا شکریہ ادا کریں گے۔

اسی طرح ہم بھی جب عالمِ آفرینش کے اس عظیم دستر خوان پر نگاہ کرتے ہیں اور خود کو ملنے والی گوناگوں نعمتوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ روشن آنکھیں، یہ سننے والے کان، یہ عقل و ہوش، یہ جسمانی اور روحانی طاقت، زندگی کے یہ مختلف وسائل اور پاک و پاکیزہ روزی۔ غرضیکہ انواع واقسام کی نعمتیں جب اس عظیم دستر خوان پر دیکھتے ہیں تو مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کو پہچانیں۔ اگرچہ اسے ہمارے شکریہ کی ضرورت نہو لیکن پھر بھی ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم اس کا شکریہ ادا کریں اور جب تک ہم اس کا شکریہ ادا نہ کرلیں اپنے اندر ناراحتی بلکہ کمی محسوس کریں گے اور یہ ایک اور دلیل ہے جو ہمیں خدا کی پہچان پر آمادہ کرتی ہے۔

۳۔ سُود و زیاں کا باہمی ارتباط

آپ ذرا تصور کریں کہ اپنے سفر کے دوران آپ ایک ایسے چوراہے پر پہنچ گئے ہیں جہاں شور و غل مچا ہوا ہے! سب کہہ رہے ہیں کہ اس چوک پر نہ ٹھہرو کیونکہ یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اور ساتھ ہی مختلف گروہ

ہمیں مختلف راستے بتانے کی کوشش کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے مشرقی راستے کو اختیار کیجیے کوئی کہتا ہے مغربی کو، لیکن ایک گروہ ایسا ہے جو مشرقی اور مغربی راستوں سے ہٹ کر ایک درمیانی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر خطرات سے بچ کر منزلِ مقصود تک صحیح وسالم پہنچنا ہے تو اس درمیانی راہ کو اختیار کریں۔

تو اس مقام پر عقلمندی کا تقاضا کیا ہے ؟

آیا بغیر کسی سوچ وبچار کے ہم کسی ایک راہ کا انتخاب کرلیں گے ؟ یا عقل ہمیں یہ اجازت دے گی کہ ہم کسی بھی راہ کا انتخاب نہ کریں اور وہیں رُک جائیں ؟ دونوں صورتوں میں جواب نفی میں ہوگا۔

عقل وخرد ہمیں یہ حکم دے گی کہ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے ہر ایک گروہ کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سُنا جائے۔ جس گروہ کے دلائل وزنی اور ثبوت ٹھوس ہوں اس کی بات پر عمل کیا جائے اور پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ راہ کا انتخاب کیا جائے۔

اس دنیاوی زندگی میں بھی ہماری یہی حالت ہے، مختلف مذاہب اور ادیان ہمیں اپنی طرف دعوت دیتے ہیں تو اس صورت میں ہمارا کیا فرض بنتا ہے؟ ظاہر ہے ہمیں وہاں پر اپنے انجام کو سوچنا ہوگا۔ اپنی خوش بختی اور بدبختی کو مدنظر رکھنا ہوگا، اپنی ترقی وپستی کو دیکھنا ہوگا۔ ان سب چیزوں کو مدنظر رکھ کر کسی صحیح راہ کا انتخاب کرنا ہوگا جو ہمیں بدبختی، بداخلاقی اور تباہی سے بچا کر خوش بختی، خوش اخلاقی اور نجات کی طرف لے جائے۔

یہ ایک اور دلیل ہے جو ہمیں خالقِ کائنات کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

قرآن مجید کا فرمان ہے:

" فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ "

" اے پیغمبرؐ! میرے بندوں کو خوشخبری دے دو جو مختلف باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کو انتخاب کرتے ہیں"

(سورۂ زمر آیہ ۱۸)

سوالات ؟

۱۔ کیا اب تک خداشناسی کے بارے میں والدین سے سننے کے علاوہ آپ نے اپنے طور پر کبھی سنجیدگی سے سوچا ہے ؟

۲۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ "خدا جوئی" اور "خداشناسی" کے درمیان کیا فرق ہے ؟ اور کیسے ؟

۳۔ خدا سے راز و نیاز کے وقت آپ نے کبھی گہری روحانی لذّت محسوس کی ؟

دوسرا سبق

ہماری زندگی میں خداشناسی کے آثار

۱۔ خداشناسی اور علمی ترقی

ذرا تصور کیجیے کہ آپ کا دوست سفر سے واپسی پر آپ کے لیے بطورِ تحفہ ایک کتاب لایا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کتاب بہت عمدہ ہے۔ اس کا لکھنے والا اعلیٰ درجہ کا دانشور، نہایت سمجھ دار اور باخبر آدمی ہے۔ نابغۂ روزگار اور فن کا استاد ہے۔

یقیناً آپ اس کتاب کا سرسری طور پر مطالعہ نہیں کریں گے بلکہ بالعکس آپ اس کتاب کی جلدبندی سے لے کر اس کے حروف اور کلمات تک کو غور سے دیکھیں گے۔ خلوت میں اس کا مطالعہ کریں گے۔ اگر اس کا کوئی جملہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو کئی کئی گھنٹوں بلکہ کئی کئی دنوں تک اس پر غور و فکر

کریں گے جب تک کہ اس جملہ کے معنی اور مفہوم آپ کی سمجھ میں نہ آجائیں اس پر غور و فکر جاری رکھیں گے کیونکہ اس کتاب کا لکھنے والا کوئی معمولی انسان نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دانشمند آدمی ہے جس کا ایک ایک حرف جچا تلا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اگر آپ کو کسی کتاب کے بارے میں کہا جائے کہ ٹھیک ہے کہ ظاہری طور پر یہ کتاب خوبصورت ہے لیکن اس کا لکھنے والا ایک کم علم آدمی ہے جس کی معلومات محدود ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر ایک گوشے میں رکھ دیں گے اور اگر مطالعہ کے دوران کوئی جملہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے لکھنے والے کی کم علمی پر محمول کریں گے اور اس کے سمجھنے کے لیے زیادہ وقت ضائع نہیں کریں گے۔

عالم ہستی بھی ایک ضخیم کتاب کی مانند ہے جس میں کائنات کا ہر ذرّہ ایک کلمے یا جملے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک خدا پرست انسان کی نظر میں کائنات کا ہر ایک ذرّہ قابل غور و فکر ہے۔ ایک باایمان شخص خدا پرستی کے آئینے میں اسرار خلقت کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتا ہے (اور یہی چیز سائنس اور انسان کے علم و دانش میں ترقی کا سبب بنتی ہے) کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا بے انتہا علم و قدرت کا مالک ہے اس کے تمام کام حکمت اور فلسفے کی بنیاد پر استوار ہیں لہٰذا وہ "کتاب ہستی" کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور خوب غور و فکر سے کام لیتا ہے تاکہ کائنات کے اسرار کو بہتر طور پر درک کر سکے۔

لیکن ایک مادہ پرست انسان "اسرار کائنات" کے بارے میں مطالعہ کرنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ "ایک بے شعور مادے" کو خالق کائنات سمجھتا ہے اور اگر کسی وقت کوئی مادہ پرست دانشمند

کشفِ علوم کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اغلب طور پر خدا کو مانتا ہے لیکن اسے "فطرت" یا "مادہ" یا کوئی اور نام دیتا ہے کیونکہ وہ "فطرت" کے کاموں کے لیے "نظم ونسق" "حساب وکتاب" اور "قاعدہ و پروگرام" کا قائل ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خدا پرستی، علم و دانش کی ترقی کا سبب ہے۔

۲۔ خداشناسی، تلاش اور اُمید

بسا اوقات انسانی زندگی میں سخت اور پیچیدہ مسائل پیش آجاتے ہیں اور امید کے دروازے ہر طرف سے بند ہو جاتے ہیں اس وقت انسان اپنے آپ کو ضعیف و ناتوان اور تنہا محسوس کرتا ہے تو اس وقت "خدا کی ذات پر ایمان" اس کی مدد کو دوڑتا ہے اور اس کی کمر ہمت بندھاتا ہے۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں خود کو تنہا اور ناتوان نہیں سمجھتے، مایوس نہیں ہوتے، ضعف اور ناتوانی کا احساس نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی قدرت تمام مشکلات پر غالب ہے اور تمام چیزیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

لہٰذا وہ خدا کی مہربانی، عنایات اور امداد سے مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس راہ میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیتے ہیں، اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سختیوں اور مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں۔

گویا:

خدا کی ذات پر ایمان، انسان کے لیے ایک عظیم سہارا ہے۔

خدا کی ذات پر ایمان، استقامت اور پامردی کا سبب ہے۔

خدا کی ذات پر ایمان، اُمید کی کرن کو ہمیشہ انسان کے دل میں روشن رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ باایمان لوگ کبھی بھی خودکشی نہیں کرتے کیونکہ خودکشی کا سرچشمہ ہمیشہ مکمّل ناامیدی اور حالات سے تنگ آکر ہتھیار ڈال دینا ہوا کرتا ہے۔ لیکن باایمان لوگ نہ تو کبھی ناامید ہوتے ہیں اور نہ ہی احساسِ شکست ان پر غالب آتا ہے۔

۳۔ خداشناسی اور احساسِ فرض

بطور مثال بہت سے ایسے ڈاکٹروں کو آپ جانتے ہوں گے کہ جس وقت کوئی نادار مریض ان کے پاس جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس سے معائنے کی فیس نہیں لیتے بلکہ دوا کی رقم بھی اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر مرض زیادہ خطرناک ہو تو مریض کے سرہانے رات گزار دیتے ہیں۔ ایسے افراد خدا پرست اور باایمان ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس ایسے ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں جو فیس لیے بغیر مریض سے بات تک نہیں کرتے کیونکہ ایسے لوگوں کا خدا کی ذات پر پختہ ایمان نہیں ہوتا۔

باایمان شخص زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہو فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے، نیکوکار اور درگزر کرنے والا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اپنے باطن میں ایک "روحانی پولیس" Police کو حاضر پاتا ہے جو ہر وقت اس کے اعمال کی نگراں ہوتی ہے۔

لیکن بے ایمان لوگ خودخواہ، خودغرض اور خطرناک ہوتے ہیں، اپنے اندر کسی قسم کا احساسِ ذمّہ داری نہیں رکھتے۔ ظلم و ستم اور دوسروں کے حقوق کو غصب کر لینا ان کے لیے معمولی بات اور نیک کاموں کی ادائیگی ان کے لیے گراں ہوتی ہے۔

۴۔ خداشناسی اور سکونِ قلب

علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں نفسیاتی بیماری اور روحانی بے چینی دوسرے تمام ادوار سے زیادہ ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کا سبب پریشانی کا احساس ہے۔ آئندہ پیش آنے والے متوقع حادثات سے پریشانی، موت سے پریشانی، فقر و فاقہ سے پریشانی اور جنگ وغیرہ سے پریشانی۔

ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ منجملہ اور چیزوں کے جو انسان کو ان پریشانیوں سے نجات دے سکتی ہے ایک چیز خدا کی ذات پر ایمان ہے کیونکہ جب بھی پریشانی کے اسباب انسان کی روح میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو "ایمانِ باخدا" کی طاقت ان کو دور دھکیل دیتی ہے۔

وہ خدا جو مہربان ہے، وہ خدا جو روزی رسان ہے، وہ خدا جو اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ ہے اور جب بھی انسان اس کی ذات کی طرف توجۂ کامل کرتا ہے تو وہ اس کی مکمل امداد کرتا ہے اور تمام پریشانیوں سے نجات دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حقیقی مومنین ہمیشہ ذہنی سکون کی دولت سے مالامال ہوتے ہیں ان کی روح اور ذہن میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی چونکہ انھیں خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ ہوتا ہے۔ اگر کسی وقت انھیں نقصان بھی پہنچتا ہے تو اس کی تلافی کے خدا سے طلب گار ہوتے ہیں حتیٰ کہ میدانِ جنگ کی سختیوں میں بھی ان کے ہونٹوں پر تبسم عیاں ہوتا ہے۔

قرآن مجید کا فرمان ہے:

"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ"

"یعنی جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا (حقیقی) امن و سکون انھیں کے لیے ہے" (سورہ انعام آیہ ۸۲)

سوالات ؟

① آیا گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا کوئی واقعہ آپ کو یاد ہے جس میں مندرجہ بالا گفتگو میں مذکور ایمان کی جھلکیاں پائی جاتی ہوں ؟

② آیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بعض لوگ مومن ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اخلاقی کمزوریاں ان میں پائی جاتی ہیں اور سبق میں مذکور چار نشانیوں میں سے کوئی ایک بھی ان میں نہیں ملتی۔ کیا وجہ ہے ؟

تیسرا سبق

خداشناسی کے دو راستے

خداشناسی کے سلسلے میں قدیم زمانے سے لے کر آج تک ہزاروں بلکہ لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور علماء اور غیر علماء کے درمیان لاکھوں کروڑوں بار بحثیں ہو چکی ہیں۔ ہر ایک نے اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے مختلف راہوں کا انتخاب کیا ہے لیکن ان تمام راہوں سے بہترین اور ہمیں عالم ہستی کے اس عظیم مرکز تک جلد پہنچا دینے والے دو راستے ہیں:

(۱) —— اندرونی (یا نزدیک ترین راستہ)

(۲) —— بیرونی (یا روشن ترین راستہ)

پہلی قسم کے بارے میں ہم اپنے وجود کی گہرائیوں میں اس راہ کو تلاش کریں گے اور توحید کی آواز اپنے باطن سے سنیں گے۔

دوسری قسم کے بارے میں ہم اس عظیم جہانِ ہستی میں سیر کریں گے۔ خدا

کی نشانیاں تمام مخلوقات کی پیشانیوں اور کائنات کے ہر ذرّے کے دل میں مشاہدہ کریں گے۔ اگرچہ ان ہر دو راستوں کے لیے طولانی بحث درکار ہے لیکن ہم کوشش کریں گے کہ ایک اجمالی گفتگو میں ان دونوں راہوں کا خلاصہ پیش کر دیں۔

اندرونی راستہ

اس موضوع پر چند نکتے قابلِ غور ہیں:

- دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہر انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی قوم اور قبیلے یا نسل اور نژاد سے کیوں نہ ہو اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے کسی قسم کی تعلیم بھی نہ دی جائے حتیٰ کہ خدا پرستوں یا مادہ پرستوں کی آواز بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے اس کے باوجود وہ خود بخود ایک ایسی مقتدر اور توانا ذات کی طرف متوجہ ہو جائے گا جو "عالم مادہ" سے بالاتر ہے اور تمام کائنات پر اسی کی حکومت ہے۔
وہ اپنے دل کے مختلف گوشوں اور قلب و روح کی گہرائیوں سے احساس کرے گا کہ اسے ایک لطیف، مہر و محبّت سے بھرپور، شیریں اور محکم آواز سنائی دے رہی ہے جو اسے علم و قدرت کے عظیم مرکز (جسے ہم "خدا" کہتے ہیں) کی طرف بلا رہی ہے۔
یہ بشر کی مقدس، ہر قسم کی آلائش سے پاک اور معصوم فطری آواز ہے۔

- ممکن ہے کہ مادی دنیا کا شور و غل اور زرق و برق دنیاوی زندگی کی چکاچوند انسان کو حقائق کے ادراک سے غافل کر دے اور وہ وقتی طور

پر پاک انسانی فطرت کی ندا کو نہ سُن سکے لیکن جب وہ خود کو مشکلات اور مصائب میں گھرا ہوا پاتا ہے اور سیلاب، زلزلے اور طوفان جیسے خطرناک مصائب میں گھر جاتا ہے یا ہوائی جہاز پر سوار ہوتا ہے لیکن موسم کی خرابی کی بنا پر ہوائی جہاز خطرناک حالات سے دوچار ہو جاتا ہے اور اسے مادی دنیا کے ظاہری وسائل کے ذریعے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تو ایسے حالات میں یہی فطری آواز اسے سنائی دیتی ہے جو اس کی ڈھارس بندھاتی ہے۔ اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندرونی وجود سے کوئی "طاقت" اسے اپنی طرف بلا رہی ہے جس کے سامنے موجودہ تمام مشکلات اور مصائب بالکل ہیچ ہیں۔

آپ بہت کم ایسے لوگوں کو پائیں گے جو زبردست مصیبتوں میں گھر جائیں اور اس "غیر مرئی طاقت" کی طرف متوجہ نہ ہوں اور غیر اختیاری طور پر خدا کو یاد نہ کریں۔ لہٰذا اسی چیز سے پتہ چلتا ہے کہ ہم اس ذات کے کس قدر قریب ہیں اور وہ ذات کس قدر ہمارے قریب ہے۔

یاد رہے کہ فطرت کی یہ آواز یوں تو ہمیشہ ہی انسان کے اندر موجود رہتی ہے لیکن حساس لمحوں میں اس میں قوت آجاتی ہے۔

● تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے قدرتمند اور مغرور لوگ جو عام حالات میں خدا کا نام لینا گوارا نہیں کرتے تھے جب انھوں نے اپنی قدرت اور طاقت کو متزلزل ہوتا دیکھا اور اپنی ہستی کے محل کو گرتا محسوس کیا تو فوراً اس مبدأ عظیم کی طرف متوجہ ہوئے اور فطری آواز کو بڑی صراحت کے ساتھ سُنا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب فرعون نے اپنے آپ کو دریائے نیل کی موجوں کے

درمیان پایا اور دیکھا کہ جو پانی اس کی زندگی کا سرمایہ، ملک کی آبادی کا سرچشمہ اور اس کی تمام مادی طاقت کا اہم ترین ذریعہ تھا آج اس کی موت کا سامان فراہم کر رہا ہے اور وہ دریا کی چند معمولی موجوں کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ نیز جان بچنے کا کوئی ظاہری وسیلہ بھی نظر نہیں آتا۔ تو چیخ کر کہتا ہے کہ:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ موسیٰؑ کے عظیم المرتبت خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں"

درحقیقت یہ آواز اس کی فطرت اور دل کی گہرائیوں سے اُٹھ رہی تھی۔ فرعون ہی پر کیا موقوف ہر وہ انسان جو اس طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے ایسی آواز کو سنتا ہے۔

● خود آپ بھی جب اپنے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیں تو اس بات کی یقیناً تصدیق کریں گے کہ وہاں ایک ایسا نور روشن ہے جو آپ کو خدا کی ذات کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ یقیناً آپ کو زندگی میں بارہا ایسے حوادث کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جن سے بچ نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی ہوگی لیکن انہی حالات میں فوراً یہ حقیقت سامنے نظر آئی ہوگی کہ اس عالم ہستی میں کوئی ایسی طاقت ہے جو آپ کو ان حوادث سے بچا سکتی ہے۔ ایسی حالت میں اس مبدأ ہستی کے ساتھ "امید اور عشق" نے آپ کو اپنی "گود" میں لے لیا ہوگا۔ جس کی وجہ سے آپ کے دل پر چھائے ہوئے ناکامی، ناامیدی اور مایوسی کے تیرہ و تاریک بادل چھٹ گئے ہوں گے۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ یہ وہ نزدیک ترین راہ ہے جسے تلاش کر کے ہر

انسان خدائے بزرگ و برتر کو پہچان سکتا ہے۔

ایک اہم سوال

ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ :

" کیا اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ ماں باپ کی تعلیمات اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے حساس اور مشکل مقامات میں ہم اس قسم کا تصور کرتے ہیں اور خدا سے اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں؟"

اس قسم کے سوال کرنے میں ہم آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور اس کا جواب اگلے سبق میں دیں گے لیکن اس سے پہلے قرآن مجید کی ایک آیت ملاحظہ فرمائیں۔

خدا فرماتا ہے :

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ ○

جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور کوہ پیکر موجوں کے تھپیڑے انھیں موت کے دہانے تک پہنچا دیتے ہیں) تو وہ خدا کو خلوص دل سے پکارتے ہیں لیکن جب انھیں خدا ساحل نجات پر پہنچا دیتا ہے تو وہ (خدا کو فراموش کر کے) شرک کرنے لگتے ہیں۔"

(سورۂ عنکبوت آیۃ ۶۵)

سوالات

۱ — مندرجہ بالا آیت قرآنی کو سورہ اور نمبر کے حوالے سے یاد کریں اور اس کے معنی کو ایک ایک کلمہ کے ساتھ حفظ کریں۔

۲ — کبھی آپ کو بھی کوئی حادثہ پیش آیا ہے جس میں آپ ہر طرف سے مایوس ہو گئے ہوں اور صرف اور صرف خدا کی ذات کا سہارا رہ گیا ہو، تفصیل سے بیان کریں۔

۳ — اس راستے کو نزدیک ترین راستہ کیوں کہتے ہیں ؟

چوتھا سبق

ایک سوال اور اس کا جواب

گزشتہ سبق میں ہم بتا چکے ہیں کہ "توحید اور خدا پرستی کی آواز ہم ہمیشہ اپنے دل کی گہرائیوں سے سنتے ہیں اور مصائب و مشکلات میں یہ آواز خاص طور پر صاف اور واضح سنائی دیتی ہے جس سے ہم بے ساختہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور اس کی لامتناہی قدرت اور بے انتہا عنایات اور مہربانیوں کے طالب ہوتے ہیں۔"

ہوسکتا ہے یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ " یہ اندرونی آواز جسے ہم "فطرت کی آواز" کہتے ہیں اپنے ارد گرد کے ماحول، مکتب و مدرسے اور ماں باپ کی تعلیمات کا نتیجہ ہے جو ہمارے لیے ثانوی عادت کی صورت اختیار کر گئی ہے وگرنہ حقیقت میں اس قسم کی کسی چیز کا وجود نہیں ہے یا دوسرے لفظوں میں توہمات اور خیالات ہیں۔"

جواب :

ایک مختصر سے مقدمے کے ساتھ ہم اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔
عادات اور رسوم ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ تاریخِ بشریت اور اقوامِ عالم میں ہمیں کوئی ایسی عادت یا رسم نہیں ملتی جو ثابت اور برقرار ہو، ممکن ہے کہ بعض چیزیں آج رسم یا عادت کی صورت اختیار کر جائیں لیکن کل وہ خود بخود بگڑ جائیں گی۔ یا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کسی ملک یا قوم میں مرسوم ہو لیکن دوسرے ملک یا قوم میں اس کا نام ونشان تک نہ ہو۔
بنا بر ایں اگر ہمیں کوئی ایسا موضوع ملتا ہے جو ابتدا سے آج تک تمام اقوام و ملل اور ہر دور میں یکساں اور بلا استثنیٰ موجود چلا آرہا ہے تو ہمیں مان لینا چاہیئے کہ یہ ایک فطری امر ہے جو انسان کی روح اور جان اور رگ و ریشے میں رچا بسا ہوا ہے۔
مثلاً بچّے سے ماں کی ماَمتا کا تعلق کسی تعلیم، پروپیگنڈے یا رائج رسوم و عادات کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ ہمیں نہ تو کسی زمانے میں اور نہ ہی کسی قوم اور ملت میں ایسی نظیر ملی کہ جس میں کسی ماں نے اپنے بچّے کے ساتھ اپنی ماَمتا کا اظہار نہ کیا ہو۔
البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ کوئی ماں اپنے مخصوص ذاتی حالات سے تنگ آ کر اپنے بچّے کو موت کے گھاٹ اُتار دے یا جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں باپ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ تو اس قسم کے واقعات استثنائی ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ جن کے انجام دینے کے فوراً بعد انسان کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ "تم نے غلط کیا ہے۔" اور جلد ہی

وہ اپنی اصلی حالت (یعنی بچے سے ماں باپ کی محبت) کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

اس مقدمے کے ساتھ ہی خدا پرستی کے بارے میں ہم موجودہ اور گزشتہ دور کے انسانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں:

- مشہور مؤرخین اور علمائے اجتماعیات کے مطابق تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں ملتا جس میں بنی نوع انسان کے درمیان "مذہب" یا "مذہب پر ایمان" موجود نہ ہو بلکہ ہر دور اور ہر زمانے میں دنیا کے ہر خطے میں "مذہب" کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خدا پرستی انسان کے قلب کی گہرائیوں اور اس کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے نا کہ کسی قسم کے رسم و رواج اور پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی قسم کے رسم و رواج یا پروپیگنڈے کا نتیجہ ہوتی تو اس قدر جاودان اور پائیدار نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ ہمارے پاس ایسے قرائن بھی موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ زمانۂ قبل از تاریخ کے لوگ بھی کسی نہ کسی طرح مذہب کے پابند تھے۔ (قبل از تاریخ کا زمانہ وہ کہلاتا ہے جس میں لکھنا پڑھنا ایجاد نہیں ہوا تھا)

البتہ ہم یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں، چونکہ ابتدائی قومیں خدا کو "مافوق طبیعت" ذات کی صورت میں پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں لہٰذا وہ اسے کائنات میں موجود چیزوں کے درمیان ڈھونڈنے کی کوشش کرتیں اور اپنی اس تلاش کو وہ بتوں کی صورت میں معرض وجود میں لے آتیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی فکر میں بھی ترقی آتی گئی اور بالتدریج انسان بت پرستی سے ہاتھ کھینچ کر اس مادی دنیا سے ماوراء خدا کی قدرت سے

آشنا ہونے لگا۔

- بعض علمائے نفسیات واضح طور پر کہتے ہیں کہ انسان کی روح میں چار اصلی حسّیں موجود ہیں۔

۱۔ "حِسِّ دانائی"
جو انسان کو علم اور دانش کے حصول پر آمادہ کرتی ہے خواہ اس علم میں کوئی مادی منفعت ہو یا نہ ہو۔

۲۔ "حِسِّ نیکی"
جو تمام بنی نوع انسان کے درمیان اخلاقی اور انسانی مسائل کا سرچشمہ ہے۔

۳۔ "حِسِّ زیبائی"
جس سے انسان کے اندر (صحیح معنوں میں) شعر، ادبیات اور ہُنر سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ "حِسِّ مَذہبی"
جو انسان کو خدا کی پہچان اور اس کے احکام بجا لانے کی دعوت دیتی ہے۔

اس ترتیب کو مدِنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "حسّ مذہبی" ہی انسان کے اندر ایک ایسی حسّ ہے جس کی جڑیں انسان کی رُوح اور دل کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہیں جو نہ تو کبھی اس سے جدا ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔

- آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ بہت سے مادہ پرست اور خدا کے وجود کے منکر لوگ بھی خدا کا نام لیے بغیر کسی نہ کسی انداز میں اس کے وجود کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور اس کو "مادہ" یا "نیچر" یا کوئی اور نام دیتے ہیں لیکن اس چیز کے لیے جو صفات بیان کرتے ہیں وہ خدا کی صفات کی مانند ہوتی ہیں۔
مثلاً وہ کہتے ہیں کہ "نیچر" نے اگر انسان کے اندر دو گردے پیدا کیے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایک گردہ کام کرنا چھوڑ دے تو دوسرا انسانی زندگی کو بچائے رکھے اور کام کرتا رہے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری دلیلیں جو وہ بیان کرتے ہیں اگر ان کو غور سے دیکھا جائے تو آیا عقلِ سلیم یہ بات تسلیم کرتی ہے کہ نیچر جیسی بے شعور چیز سے ایسے کام معرضِ وجود میں آئیں ؟ یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے کام صرف خداوند دانا و بینا کے دستِ قدرت کے شاہکار ہیں جس کے علم اور قدرت کی کوئی انتہا نہیں ؟

اس بحث کا خلاصہ ہم اس طرح کریں گے کہ :
" خداوند عالم کی ذات سے محبّت اور عشق ہمیشہ ہمارے دل و جان میں موجود رہے اور موجود رہے گا۔"
خدا کی ذات پر ایمان ایک ایسا جاودانی شعلہ ہے جو ہمیشہ ہمارے قلب اور روح کو گرمائے رکھتا ہے۔
ضروری نہیں ہے کہ خدا کی شناخت کے لیے ہم دور دراز کا سفر کریں

بلکہ اگر تھوڑا سا بھی اپنے اندر غور و فکر کریں تو فوراً اس کی ذات پر ایمان لے آئیں گے۔

خدا فرماتا ہے:

"نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ"

"یعنی ہم انسان کے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں"۔

(سورہ ق آیۃ ۱۶)

سوالات ؟

۱ — عادت اور فطرت کے لیے چند مثالیں پیش کیجیے۔

۲ — نادان لوگ کیوں بت پرستی کرتے تھے؟

۳ — مادہ پرستوں نے خدا کا نام "فطرت" یا نیچر کیوں رکھا ہے۔؟

پانچواں سبق

ایک سچی داستان

ہم بتا چکے ہیں کہ بعض لوگ زبان سے تو خدا کا انکار کرتے ہیں لیکن درحقیقت خدا پر ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات غیر معمولی کامیابی یا اعلیٰ عہدے کا حصول (کم ظرف) انسان کا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ جس سے وہ مغرور ہو کر اپنی حیثیت کو بھول جاتا ہے۔ لیکن جب طوفان حوادث اس کو جھنجھوڑتے ہیں اور مصائب و مشکلات کی تند و تیز آندھیاں ہر طرف سے اس پر حملہ آور ہوتی ہیں تو عقل ٹھکانے آجاتی ہے اور غرور اور خود غرضی کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ جاتے ہیں اور فطری طور پر توحید اور خداشناسی اس کے لیے آشکار ہو جاتی ہے۔

تاریخِ بشریت اس قسم کے نمونوں سے بھری پڑی ہے جس میں سے ایک کی داستان ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

کسی ملک کا ایک وزیر تھا۔ ہر قسم کا اقتدارِ اعلیٰ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کسی کو اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ ایک دن وہ ایک ایسی محفل میں گیا جس میں کچھ دینی علمار موجود تھے۔ وہ محفل میں داخل ہوتے ہی علمار سے مخاطب ہوا :

"آپ کب تک کہتے رہیں گے کہ دنیا میں خدا موجود ہے ؟ حالانکہ میرے پاس اس کی نفی میں ہزاروں دلیلیں موجود ہیں"

یہ بات اس نے خاص متکبرانہ انداز میں کہی۔

چونکہ علمار جانتے تھے کہ وہ منطقی اور استدلالی بات سُننا پسند نہیں کرتا اور اقتدار کے نشے نے اسے اس قدر مغرور کر دیا ہے کہ حق بات اس پر اثر نہیں کر سکتی۔ لہٰذا انھوں نے حقارت آمیز بے پر وائی کے ساتھ خاموشی اختیار کر لی۔

بات آئی گئی ہو گئی اور ایک زمانہ گزر گیا۔ ایک مرتبہ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وزیر موصوف کو کسی الزام میں حکومتِ وقت نے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

مذکورہ محفل میں موجود ایک عالم نے سوچا کہ اب اس کے "بیدار" ہونے کا وقت آگیا ہے۔ وہ غرور کے گھوڑے سے اُتر چکا ہے، خود غرضی کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ چکے ہیں اور حق کو قبول کرنے کی حِس بیدار ہو چکی ہے لہٰذا اگر اس وقت اس سے ملاقات کر کے اسے نصیحت کی جائے تو یقیناً سود مند ثابت ہو گی چنانچہ وہ ملاقات کی اجازت لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ جونہی وہ اس کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ وزیر اکیلے کمرے میں سلاخوں کے

پیچھے ٹہل رہا ہے اور فکر میں ڈوبا ہوا بڑبڑا رہا ہے۔ جب اس نے غور کیا تو وہ یہ مشہور شعر پڑھ رہا تھا ؂

ما ہمہ شیران ولی شیرِ علم
حملہ مان از باد باشد دم بدم!
حملہ مان پیدا و ناپیدا است باد
جان فدائے آن کہ ناپیدا است باد!

یعنی ہم اس شیر کی مانند ہیں جو جھنڈوں پر چھپا ہوتا ہے جب ہوا چلتی ہے تو اس کے جھونکوں سے حرکت میں آجاتا ہے گویا ابھی حملہ ہی کرنا چاہتا ہے۔ درحقیقت ازخود اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہوا کے جھونکے اسے ادھر ادھر لے جاتے ہیں۔
بعینہ ہماری بھی یہی حالت ہے ازخود ہمارے پاس بھی کچھ نہیں ہوتا خواہ ہم کتنے ہی قدرت مند کیوں نہ ہوں!!
جس خدا نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے جب چاہے ہم سے واپس لے سکتا ہے۔

عالم نے دیکھا کہ ان حالات میں وہ صرف خدا کا معترف ہی نہیں بلکہ زبردست خداشناس بھی بن چکا ہے۔ اس نے وزیر سے خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد کہا:

"آپ کو یاد ہوگا ایک دن آپ نے کہا تھا کہ وجود خدا کی نفی پر میرے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ ان ہزاروں دلائل کو صرف ایک جواب سے باطل کروں۔ یاد رکھو! خدا وہ ذات ہے جس نے اتنی بڑی طاقت کو آپ سے بآسانی چھین

لیا ہے۔"

وزیر نے اس کی بات سُن کر سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تھا اور اپنے باطن میں خدا کے نور کو دیکھ رہا تھا۔

خداوندِ عالم فرعون کے بارے میں فرماتا ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ۔

"جب (فرعون) غرق ہونے لگا تو اس نے (چیخ کر) کہا میں ایمان لے آیا ہوں کہ بنی اسرائیل کے معبود کے علاوہ اور کوئی قابل پرستش نہیں۔"

(سورہ یونس آیۃ ۹۰)

سوالات ؟

(۱) اس سچی داستان کا نتیجہ چند سطروں میں تحریر کریں؟

(۲) بنی اسرائیل کو، بنی اسرائیل کیوں کہتے ہیں؟

(۳) فرعون کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ اور اس کا کیا دعویٰ تھا؟

چھٹا سبق

خداشناسی کا دوسرا راستہ

بیرونی راستہ:

جس جہانِ ہستی میں ہم رہ رہے ہیں اسے اگر ایک سادہ سی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ کائنات باقاعدہ نظام کے تحت چل رہی ہے اور یہ (کائنات) ایک عظیم لشکر کی مانند ہے جس کے مختلف یونٹ ہیں اور ہر یونٹ اپنے معین مقصد کی طرف رواں دواں ہے۔

مندرجہ ذیل نکات اس سلسلے میں ممکنہ درپیش آنے والے تمام ابہام کو دور کرسکتے ہیں۔

- کسی جاندار کے معرضِ وجود میں لانے اور اسے زندہ رکھنے کے لیے ایک سلسلۂ قوانین اور چند خاص شرائط کی ضرورت ہوتی ہے جن کا باہمی ارتباط ضروری ہے۔

مثلاً ایک درخت اگانے کے لیے، زمین، مناسب آب وہوا اور مقررہ درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ جب بھی اس کا بیج ڈالا جائے تو وہ بخوبی وہاں سے غذا حاصل کرکے صحیح معنوں میں نشو ونما پا سکے۔ اور اگر مذکورہ چیزیں موجود نہ ہوں تو دانے کا نشو ونما پانا غیر ممکن ہوجاتا ہے۔ لیکن ان شرائط کے انتخاب اور مقدمات کی فراہمی کے لیے عقل، علم اور دانش کی ضرورت ہوتی ہے۔

- کائنات میں موجود ہر چیز کا اپنا ایک مخصوص اثر ہوتا ہے۔ آگ کا اپنا اثر ہوتا ہے اور پانی کا اپنا۔ جو کسی بھی حالت میں ان سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اثر ایک اٹل قانون کے تابع ہوتا ہے۔

- کائنات میں تمام زندہ موجودات کے اعضاء کا آپس میں باہمی رابطہ موجود ہے جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ نمونے کے طور پر انسان ہی کو لے لیجیے (جو بذات خود ایک مستقل کائنات کی حیثیت رکھتا ہے) بوقت ضرورت اس کے تمام اعضاء ارادی اور غیر ارادی طور پر مکمل ہم آہنگی کے ساتھ مصروف عمل ہو جاتے ہیں مثلاً اگر انسان کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو اس سے بچاؤ کے لیے سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کی ہم آہنگی اور باہمی رابطہ سے ہمیں اس عظیم کائنات کے تمام موجودات کے درمیان باہمی رابطے اور نظم وضبط کا پتہ چلتا ہے۔

- اس کائنات پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نہ

صرف موجوداتِ عالم کے اعضاء کا آپس میں باہمی رابطہ موجود ہے بلکہ اعضاً کی مانند ایک موجود کا دوسرے موجود سے بھی باہمی رابطہ موجود ہے۔ مثلاً کسی چیز کی پرورش اور اسے پروان چڑھانے کے لیے سورج اپنی روشنی ڈالتا ہے، بادل پانی برساتا ہے، ہوا خنکی بہم پہنچاتی ہے اور زمین اور دوسرے زمینی ذرائع مختلف طریقوں سے مدد کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ایک باقاعدہ اور منظم نظام کے تحت رواں دواں ہے۔

"نظم" اور "عقل" کا باہمی رابطہ :

یہ حقیقت ہر باشعور انسان پر روزِ روشن کی طرح آشکار ہے کہ جہاں بھی "نظم و ضبط" کا وجود ہوگا وہیں پر "عقل و فکر" اور "خاص مقصد" بھی موجود ہوں گے۔ کیونکہ انسان جہاں بھی نظم و ضبط، حساب و کتاب اور اٹل قوانین کو دیکھتا ہے وہاں اسے علم و قدرت کے عظیم مرکز و مبداء کی جستجو کا خیال بھی ضرور آتا ہے اور اسے اپنے اس مافی الضمیر کے ادراک کے لیے کسی قسم کی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وہ سمجھتا ہے کہ ایک نابینا اور بے علم آدمی ٹائپ رائٹر کے ذریعے کسی موضوع پر ہرگز مقالہ نہیں لکھ سکتا اور نہ ہی دو سال کا بچہ کسی کاغذ پر قلم کے ذریعے الٹی سیدھی لکیریں مار کر کسی شاندار منظر کی نقشہ کشی کر سکتا ہے۔ بلکہ اگر ہمیں کہیں پر کوئی شاندار عبارت نظر آتی ہے یا کوئی قیمتی مقالہ پڑھنے کو مل جاتا ہے یا کسی دلفریب منظر کی حسین نقاشی کو دیکھتے ہیں تو ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کام کسی اہلِ علم عقلمند اور باشعور انسان کا ہے۔ اگرچہ ہم نے اس کی صورت کو دیکھا تک نہ ہو۔

بنابرایں جہاں بھی نظم وضبط کا وجود ہوگا وہاں پر عقل وخرد کا ہونا ضروری ہے۔ جس قدر کوئی تخلیق عظیم، گہری اور جاذب نظر ہوگی اسی قدر اس کے موجد (عقل وعلم) کی عظمت کا پتہ چلے گا۔

بسا اوقات اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے کہ "ہر منظم تخلیق کے لیے عقل و دانش کی ضرورت ہوتی ہے۔" اعلیٰ ریاضیات کی خصوصی بحث "تخمینی حساب" سے استفادہ کیا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ مثلاً اگر ایک ان پڑھ انسان کے سامنے ایک ٹائپ رائٹر رکھ دیا جائے اور اسے کہا جائے کہ کوئی شعر یا مقالہ ٹائپ کردے اور وہ بھی اپنی سمجھ کے مطابق اس کے الفاظ پر ہاتھ مارتا رہے تو "تخمینی حساب" کی رو سے اس کام کے لیے اربوں سال درکار ہوں گے حتیٰ کہ کرۂ ارض کی عمر اس کے لیے ناکافی ہوگی۔

(مزید تفصیلات بڑی کتابوں میں درج ہیں)

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۔

"ہم (تخلیق کائنات کے بارے میں) انھیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) اور خود انہی کے اپنے وجود میں دکھائیں گے تاکہ انھیں (اچھی طرح) علم ہو جائے کہ وہ برحق ہے آیا اس (خدا) کے وجود کے ثبوت کے لیے یہ بات کافی نہیں کہ وہ تمام چیزوں کے اسرار سے پوری طرح باخبر ہے۔" (سورۂ فصلت آیۃ ۵۳)

① جو مثالیں سبق میں بیان کی گئی ہیں انھیں چھوڑ کر صنعتی کارخانوں کی چند ایسی مثالیں پیش کریں جنھیں دیکھ کر "ایک بنانے والے، آگاہ اور عالم" کے وجود کی ضرورت محسوس ہو۔

② "آفاق" اور "انفس" کے درمیان کیا فرق ہے؟ آفاق اور انفس میں موجود خدا کی نشانیاں بیان کریں۔

ساتواں سبق

تخلیقِ کائنات کے مختلف نمونے

تخلیقِ کائنات کے نظام میں "نظم وضبط" اور "مہارت" بڑی وضاحت کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں پر ہم چند چھوٹے بڑے نمونے آپ کے لیے ذکر کرتے ہیں۔

ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ موجودہ دور میں سائنس نے ہمارے لیے خداشناسی کے کئی دروازے کھول دیے ہیں جن سے عالمِ ہستی کی کئی تعجب آور چیزیں ہمیں دکھائی دے رہی ہیں۔ خواہ وہ انسانی ڈھانچے کی بناوٹ کے بارے میں ہوں یا حیوانات اور نباتات کی تخلیق کے سلسلے میں۔ ایٹم (جوہر) سے لے کر ستاروں کی دنیا تک کے بارے میں عجیب وغریب انکشافات ہورہے ہیں۔ جس سے ہم جرأت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کی تمام کتابیں درحقیقت توحید اور خداپرستی کی کتابیں ہیں جو ہمیں عظمتِ پروردگار کا درس دیتی ہیں۔

کیونکہ ان کتابوں میں کائنات کی اہم موجودات کے اسرار کو بیان کیا گیا ہے۔
جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس جہان کا خالق کس قدر عالم اور قادر ہے۔

۱۔ حکومتِ بدن کے کمانڈر کا مرکز

انسانی کھوپڑی کے اندر خاکستری رنگ کا ایک مادہ ہے جسے ہم "مغز" کہتے ہیں اور یہی مغز درحقیقت انسانی جسم کا اہم ترین اور حساس ترین حصہ ہے کیونکہ اس کا کام تمام اعضائے بدن کو کمانڈ اور انھیں کنٹرول کرنا ہے۔ انسانی جسم کے اس عظیم مرکز کی اہمیت بیان کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ آپ مندرجہ ذیل خبر پڑھ لیں:

کچھ عرصہ پہلے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک نوجوان طالب علم ٹریفک کے حادثہ میں زخمی ہوگیا۔ حادثہ کے دوران صرف اس کے مغز پر چوٹ لگی اور باقی بدن بالکل صحیح سالم طور پر بچ گیا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ صرف اس دماغی چوٹ سے ہی اپنی گزشتہ تمام زندگی کو فراموش کر بیٹھا۔ اس کی فکر بخوبی کام کرتی، مطالب کو بھی سمجھ لیتا لیکن اگر اپنے ماں باپ کو دیکھتا تو انھیں والدین کی حیثیت سے نہ پہچان پاتا۔ نیز جب اسے کہا جاتا کہ یہ تمھارے والدین ہیں تو وہ اس بات پر تعجب کا اظہار کرتا۔ آخر کار اسے اپنے گھر لے جایا گیا اور شناخت کے لیے دیواروں پر لگی ہوئی خود اس کے ہاتھوں سے بنی ہوئی چیزیں اسے دکھائی گئیں۔ اس پر بھی اس نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ ان تمام چیزوں کو میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ اس دماغی چوٹ سے اس کے خلیوں کا باہمی رابطہ ٹوٹ گیا ہے جو ایک تار کی مانند اس کے "فکر" اور "حافظے" کے درمیان

موجود تھا اور جس طرح بجلی کا فیوز اڑ جاتا ہے اور سارا ماحول تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی سابقہ یادداشتیں فراموشی کی تاریکی میں ڈوب گئیں۔

ہو سکتا ہے اس کے مغز کے جس نقطہ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا وہ سوئی کی نوک سے زیادہ باریک ہو لیکن اس کی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی مغز کی مشینری کس قدر پیچیدہ اور اہم ہے۔!!

مغز اور اعصاب کا سلسلہ دو اہم حصّوں پر مشتمل ہے :

① اعصاب ارادی :

جن سے بدنِ انسانی کی تمام اختیاری حرکتوں کا تعلق ہے۔ مثلاً چلنا پھرنا، دیکھنا، بات کرنا ...... وغیرہ وغیرہ۔

② اعصاب غیر ارادی :

جو قلب اور معدے اور اس طرح کے دوسرے اعضاء کو چلائے رکھتے ہیں چنانچہ اگر مغز کے اس حصّے کا ایک معمولی سا گوشہ بھی کام کرنا چھوڑ دے تو ہو سکتا ہے کہ دل یا کوئی دوسرا اہم ترین عضو بیکار ہو جائے۔

مغز کا ایک اور عجیب ترین حصّہ :

"مُخ" (یعنی دماغ) مغز کا ایک اہم اور حساس ترین حصّہ ہے جو کہ ارادہ، ہوش، شعور اور حافظے کا مرکز ہے۔ روح سے متعلق بہت سے رد عمل کا تعلق اسی حصے سے ہوتا ہے۔ مثلاً غم و غصہ، خوشی اور غمی وغیرہ

اگر کسی جانور کے مغز سے صرف دماغ کو اٹھا لیا جائے تو وہ زندہ تو ضرور رہے گا لیکن فہم و شعور مکمل طور پر کھو بیٹھے گا۔ چنانچہ ایک کبوتر کے مغز سے

اس کا دماغ جُدا کر لیا گیا تو جب تک زندہ رہا اگر اس کے سامنے کوئی دانہ ڈالا جاتا تو وہ اسے پہچان ہی نہ پاتا اور یوں غذا کی موجودگی میں وہ بھوکا رہتا۔ اگر اسے اُڑایا جاتا تو وہ کسی چیز سے ٹکرا کر نیچے گر پڑتا تھا۔

ایک اور حیرتناک حصّہ

حافظہ:

اس کے بارے میں کبھی آپ نے سوچا ہے کہ یہ کس قدر حیرتناک ہے؟ اور اگر ایک گھنٹہ یہ حافظہ ہم سے چھین لیا جائے تو ہمارا کیا انجام ہوگا؟ حافظے کا مرکز جو مغز کے ایک چھوٹے سے حصّے میں ہے ساری زندگی کی یادداشتوں کا ریکارڈ روم ہے۔ جس شخص نے بھی ہمارے ساتھ ملاقات کی یا کبھی معاشرت کی اس کے تمام کوائف کو اس نے اپنے پاس محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اس کی قدوقامت شکل وصورت، رنگ ولباس اور عادات واطوار غرضیکہ اس کی تمام خصوصیات حافظہ کے ریکارڈ روم میں موجود ہیں اور ہر شخص کا علیحدہ علیحدہ مکمل ریکارڈ اسی کے پاس ہے۔ جوں ہی ہم نے کسی سے ملاقات کی تو ہماری سوچ نے فوراً حافظے کے ریکارڈ روم سے اس کی فائل نکال لی، اس پر فوری طور پہ ایک نظر ڈالی اور اسی وقت ہمیں حکم دے دیا کہ ملنے والے سے کیسا سلوک کرنا چاہیے۔ اگر دوست ہے تو اس کا احترام کریں گے اور اگر دشمن ہے تو اظہار نفرت۔ لیکن یہ سب کچھ اس قدر فوری طور پر انجام پاتا ہے کہ وقت کے لحاظ سے تقریباً کسی قسم کا فاصلہ محسوس نہیں ہوتا۔

اس بات کی حیرت اور اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب حافظے

ہیں موجود تمام ریکارڈ کو کاغذ کے صفحات یا ٹیپ ریکارڈر یا مووی کیمرہ کی ٹیپوں پر منتقل کیا جائے۔ آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ کس قدر ٹیپیں اور کتنا کاغذ کام آئے گا؟ اور پھر ضرورت کے لحاظ سے کسی فائل کو فوری طور پر باہر نکالنے کے لیے کس قدر ملازمین اور ریکارڈ کیپرز کی ضرورت ہوگی؟ لیکن یہ تمام کام ہمارا حافظہ بڑی جلدی اور نہایت آسانی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

بے شعور چیز شعور کو پیدا نہیں کر سکتی:

مغزِ انسانی کی حیرت ناک داستانیں بڑی بڑی کتابوں میں درج ہیں جن کا مختصر حصّہ آپ نے اسکولوں اور کالجوں کی کتابوں میں پڑھا ہوگا تو کیا ایسی صورت میں یہ بات ممکن ہے کہ اس قدر بے انتہا ظریف، لطیف، پیچیدہ اور اسرار آمیز چیز ایک بے شعور مادے کی پیداوار ہو؟ اس سے بڑھ کر تعجّب کی اور کیا بات ہوگی کہ ہم کسی عقل و خرد سے عاری چیز کو عقل کا خالق مان لیں؟

قرآن مجید فرماتا ہے:

"........... وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ"

"اور خود تمھارے وجود میں (خدا کی قدرت اور عظمت کی نشانیاں موجود ہیں) کیا تم انھیں نہیں دیکھ پاتے۔

(سورۂ ذاریات آیۃ ۲۱)

؟ سوالات

① انسانی مغز کے بارے میں اور عجیب مطالب بھی آپ جانتے ہیں؟ اگر جانتے ہیں تو بیان کریں۔

② مختلف حوادث سے بچانے کے لیے خداوندِ عالم نے انسانی مغز کی حفاظت کے لیے کیا کیا ہے؟

آٹھواں سبق

ایک چھوٹا سا حیرتناک پرندہ

اس سبق میں ہم چاہتے ہیں کہ "تن کی دنیا" سے باہر نکلیں (اگرچہ ہم اس کے ہزاروں شہروں میں سے ایک کوچہ میں بھی اچھی طرح نہیں گھوم پھر پائے تھے) اور اس طرح وسیع کائنات کے ہر ہر گوشے میں پہنچ کر کچھ نمونے حاصل کریں۔

ہم رات کی تاریکی میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں تو تاریکی کے مختلف پردوں کے درمیان ایک عجیب وغریب پرندے کو اڑتا پھرتا دیکھتے ہیں جو اپنی غذا کی تلاش میں بڑی تیزی اور جرأت کے ساتھ ادھر ادھر اُڑتا پھر رہا ہے۔

یہ پرندہ "خفاش" یا "چمگادڑ" ہے۔ جس کی ویسے تو ہر چیز ہی عجیب و غریب ہے لیکن رات کی تاریکی میں اس جرأت کے ساتھ پرواز سب سے زیادہ

حیرت ناک ہے۔ رات کی تاریکی میں کسی چیز کے ساتھ ٹکرائے بغیر اس کی تیز و تند رفتار اس قدر حیرتناک ہے کہ ہم جس قدر اس کے بارے میں غور کریں نت نئے اسرار و رموز منکشف ہوں گے۔

رات کی تاریکی میں یہ اسرار آمیز پرندہ بالکل اسی طرح پرواز کرتا ہے جس طرح کہ دن کی روشنی میں کبوتر یا دیگر پرندے۔

اگر اس کے پاس رات کی تاریکی میں ٹکراؤ سے بچنے کے وسائل موجود نہ ہوں تو یقیناً کسی چیز سے اس کا ٹکراؤ ہو جائے۔ اگر اسے کسی تاریک و باریک اور دھوئیں سے بھری ہوئی پرپیچ و خم سرنگ میں چھوڑ دیا جائے تو یقین جانیئے کہ نہ تو اس کی سرنگ کی دیوار سے ٹکر ہو گی اور نہ ہی اس کے پروں پر دھوئیں کا نام و نشان ہو گا۔

چمگادڑ کی یہ خاصیت مرہون ہے ایک خاص چیز کی جس میں " راڈار " کی سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

علم فزکس میں " صوت " یعنی آواز کے بارے میں ایک خاص موضوع ہے جس میں " ماورائے صوت " لہروں کے بارے میں خاص طور پر بحث کی گئی ہے یہ وہ لہریں ہیں جن کا تسلسل اور طول اس قدر زیادہ ہے کہ انسانی کان ان کے درک سے عاجز ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں " ماورائے صوت " کہتے ہیں۔

ان لہروں کو ایک طاقتور ٹرانسمیشن کے ذریعے پیدا کر کے معین مقام پر بھیجا جاتا ہے۔ لیکن جوں ہی وہ فضا میں کسی رکاوٹ (دشمن کے ہوائی جہاز یا اسی طرح کی دوسری رکاوٹ) سے ٹکراتی ہیں تو جس طرح گیند دیوار سے ٹکرا کر واپس اپنی جگہ پر آتی ہے اسی طرح یہ بھی اپنی جگہ واپس آجاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم پہاڑیوں کے درمیان بلند آواز سے بولتے ہیں تو یہ آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر ہمارے پاس واپس آتی ہے۔ فاصلۂ زمانی کو مدنظر رکھ کر " راڈار " کو

بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

بہت سے ہوائی اور بحری جہازوں کو "راڈار" کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے اور منزلِ مقصود تک ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اسی طرح راڈار ہی کے ذریعہ دشمن کے بحری اور ہوائی جہازوں کا سراغ لگایا جاتا ہے۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ اس چھوٹے سے پرندے میں بھی "راڈار" کی مانند ایک چیز موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اسے کسی بند کمرے میں اڑایا جائے اور ماورائے صوت کو اخذ کرنے کا مائیکروفون نصب کر دیا جائے تو کمرے میں ایک ایسا ہمہمہ سنائی دے گا جس سے کان پھٹنے لگیں گے اور ہر سیکنڈ میں ۳۰ سے ۶۰ لہروں کی آواز اس پرندے کے جسم سے سنائی دے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چمگادڑ کے کس عضو سے یہ لہریں اٹھتی ہیں؟ اور پھر اس کے کس عضو میں جذب ہو جاتی ہیں؟

اس سوال کا جواب دانشمند حضرات یہ دیتے ہیں کہ یہ لہریں چمگادڑ کے طاقتور حلق کے پٹھوں میں پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے سوراخ سے خارج ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہیں اور اس کے بڑے بڑے کانوں سے جا ٹکراتی ہیں۔

بنا بر ایں چمگادڑ اپنی شبانہ پرواز میں اپنے کانوں کی محتاج ہے۔ "زورین" نامی ایک روسی دانشمند نے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ اگر چمگادڑ کے کان کاٹ لیے جائیں تو وہ تاریکی میں پرواز نہیں کر سکے گی اور اگر پرواز کرے گی بھی تو کسی نہ کسی جگہ جا ٹکرائے گی۔ لیکن اگر اس کی آنکھیں نکال لی جائیں تو وہ پوری مہارت کے ساتھ پرواز کر سکے گی۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنے کانوں سے دیکھتی ہے نہ کہ اپنی آنکھوں سے۔ اور یہی چیز ہمارے لیے حیرتناک ہے۔

اس مقام پر آپ خوب غور کیجیے کہ ایک مختصر سے جسم میں دو عجیب و غریب

اور محیّر العقول "سیٹ" (ایک لہروں کے بھیجنے والا اور دوسرا وصول کرنے والا) کس نے پیدا کیے ؟ اور پھر ان سے کام لینے کا طریقہ اسے کس نے سکھایا ؟ سچ سچ کس نے ؟؟

کیا عقل وشعور سے خالی نیچر یا مادے نے ؟

آیا ایسا ممکن ہے ؟

جبکہ اس طرح کے سیٹ بنانے میں بڑے بڑے دانشمند اپنا قیمتی وقت اور عظیم سرمایہ خرچ کرتے ہیں۔ کئی افراد ان کی دیکھ بھال اور مرمت پر مامور ہوتے ہیں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں چمگادڑ کی پیدائش کے بارے میں ایک تفصیلی خطبہ کے دوران فرمایا :

" لَا تَمْتَنِعُ مِنَ الْمُضِيِّ فِيهِ لِغَسَقِ دُجُنَّتِهِ ...... فَسُبْحَانَ الْبَارِئِ لِكُلِّ شَيْءٍ عَلَىٰ غَيْرِ مِثَالٍ "

یعنی وہ سخت تاریکی میں بھی چلنے سے باز نہیں آتی... ..... پس پاک اور منزّہ ہے وہ ذات جس نے تمام چیزوں کو سابقہ نمونے کے بغیر پیدا کیا ہے۔

(خطبہ نمبر ۱۵۵)

---

① چمگادڑ کی تخلیق کے بارے میں آپ اور کیا جانتے ہیں؟

② آیا آپ جانتے ہیں ؟ کہ چمگادڑ کے پَر ، اس کے بچہ جَننے کا انداز حتیٰ کہ اس کے سونے کے طور طریقے دوسرے جانوروں سے بالکل مختلف ہیں ۔ یعنی وہ مکمل طور پر ایک عجیب وغریب پرندہ ہے۔

نواں سبق

پھولوں اور حشرات کی دوستی

موسمِ بہار کے آخری ایّام میں جبکہ موسمِ گرما کی آمد آمد ہو آپ کسی سرسبز اور خوبصورت باغ یا شاداب و تروتازہ اور لہلہاتے کھیت میں چلے جائیں، جہاں آپ کو چھوٹے چھوٹے حشرات، شہد کی مکھیوں، سنہری مکھیوں، خوبصورت پروانوں اور باریک باریک مچھروں کے جُھنڈ کے جُھنڈ نظر آئیں گے جو خراماں خراماں نہایت آرام وسکون کے ساتھ اِدھر اُدھر آجا رہے ہوں گے۔ ایک پھول سے دوسرے پھول اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی کی جانب محوِ پرواز ہوں گے۔

وہ اس کام میں اس قدر مصروف اور سرگرم عمل ہیں گویا کوئی ان دیکھی طاقت ان کو کنٹرول کر رہی ہے۔ ان کے پاؤں پھولوں کی زرد رنگ کی گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔ وہ ایسے مزدوروں کے روپ میں ہیں جنھوں

نے اپنے کام کا مخصوص لباس پہنا ہوتا ہے۔ وہ اس حالت میں اپنی ڈیوٹی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان کے ذمہ اہم کام اور سخت ڈیوٹی لگی ہوئی ہے اس قدر اہم کہ "پروفیسر لیوّن برٹین" کے الفاظ میں:

" اگر یہ حشرات نہ ہوں تو ہماری ٹوکریاں پھلوں سے خالی ہو جائیں ۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

یہاں پروفیسر کے اس جملے کے ساتھ ہم ایک اور جملے کا اضافہ کرتے ہیں کہ:

" چند سالوں کے بعد باغوں اور کھیتوں کی یہ تروتازگی اور شادابی بھی جاتی رہے گی۔"

درحقیقت یہ حشرات ہی تو ہیں جو پھلوں کو پروان چڑھانے اور پھولوں کا بیج مہیا کرتے ہیں۔

یقیناً آپ پوچھیں گے "کیوں"؟ اس لیے کہ وہ نباتات کے لیے ایک حساس ترین عمل (لقاح) یعنی افزائشِ نسل کا کام انجام دیتے ہیں۔ بلاشبہ آپ نے یہ بات ضرور سُنی ہو گی کہ اکثر حیوانات کی مانند پھول بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں اور جب تک ان میں "تلقیح" یعنی افزائش نسل کا کام انجام نہ پائے بیج اور دانہ حتیٰ کہ پھل اور میوہ حاصل نہیں ہو سکتے۔

آیا آپ نے کبھی یہ بھی غور فرمایا ہے کہ نباتات کی مختلف قسمیں، جن میں کسی قسم کی حس اور حرکت نہیں ہوتی، کس طرح وہ ایک دوسرے کے نزدیک آتے ہیں؟ کس طرح نر پودے کا بورا جو کہ مَرد کے نُطفے

(اسپورماٹوزوئیڈ) کے حکم میں ہوتا ہے۔ مادہ کے بورے جوکہ عورت کے نطفے (اوول) کے حکم میں ہوتا ہے کے ساتھ جاملتا ہے اور ان کے "ازدواج" کے مقدمات فراہم ہوتے ہیں۔ یہ کام بعض مقامات پر یہی حشرات انجام دیتے ہیں اور بعض موقعوں پر "ہوائیں"۔

اور جیسا کہ ہم خیال کرتے ہیں یہ کام اسی طرح سادگی کے ساتھ انجام نہیں پاتا۔ بلکہ یہ "بابرکت ازدواج" جو "حشرات" کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس کی باقاعدہ اپنی تاریخ اور حیرت انگیز طولانی ماجرا ہے جس کا مختصر ساشمہ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

۲۔ دو قدیمی اور گہرے دوست

سائنسدانوں نے ایک گہرے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نباتات اور پھول وغیرہ "زمین شناسی" کے دوسرے نیم دورے میں معرض وجود میں آئے ہیں اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ حشرات بھی اسی دوران وجود میں آئے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کا آپس میں قدیم تاریخی رشتہ ہے۔ یہ ابتدائے آفرینش سے آج تک آپس میں دو وفادار اور گہرے دوستوں کی مانند چلے آرہے ہیں۔ نیز ایک دوسرے کے وجود کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے اسباب بھی مہیا کرتے آرہے ہیں۔

پھول اپنے سدا کے دوستوں (حشرات) کی محبت حاصل کرنے اور ان کا منہ میٹھا کرنے کے لیے خوش ذائقہ اور مزیدار شیرینی (نوش) کو اپنے اندر جمع کیے ہوتے ہیں اور جب حشرات نر پودے کے بورے کو منتقل کرنے اور افزائش نسل کا عمل انجام دینے کے لیے ان کے اندر داخل ہوتے ہیں تو وہ

یہ شیرینی انھیں بلاقیمت پیش کرتے ہیں۔ یہ انمول اور "مخصوص شکر" حشرات کے لیے اس قدر جاذب اور خوش ذائقہ ہوتی ہے کہ وہ بے ساختہ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

بہت سے ماہرین نباتات کا کہنا ہے کہ پھولوں کی زیبائش اور ان کی خوشبو بھی حشرات کو اپنی طرف جذب کرنے میں موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ چنانچہ شہد کی مکھیوں پر جو تجربات کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھولوں کے رنگ کو پہچانتی اور خوشبو کا ادراک رکھتی ہیں۔

درحقیقت یہ پھول ہی ہوتے ہیں جو خود کو مزین اور خوشبو سے آراستہ کرتے ہیں جس سے باذوق پروانے اور خوش سلیقہ شہد کی مکھیاں ان کی طرف بڑے شوق کے ساتھ کھنچ کر آجاتے ہیں اور پھولوں کی دعوت بڑی خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

یہی مخصوص شکر و شیرینی ہوتی ہے جو حشرات کی محبوب و مرغوب غذا شمار کی جاتی ہے اور اگر اسے ایک جگہ اکٹھا کیا جائے تو شہد بن جاتی ہے کیونکہ جب حشرات پھولوں کے پاس جاتے ہیں تو شیرینی کا کچھ حصہ تو وہ وہیں پر نوش جان کرتے ہیں اور کچھ اپنے ساتھ لا کر اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ محبت اور دوستی کا یہ معاہدہ جو باہمی "منفعت رسانی" کی بنیاد پر استوار ہے پھولوں اور حشرات کے درمیان ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

توحید کا سبق:

جب انسان حشرات اور پھولوں کی زندگی کے ان حیرت انگیز نکات پر توجہ کرتا ہے تو وہ اپنے سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان کے درمیان

محبّت اور دوستی کا یہ معاہدہ کس نے قرار دیا ہے؟ پھولوں کو خوش ذائقہ اور مزیدار شیرینی کس نے دی ہے؟ ان کو زیبائش اور خوشبو کس نے عنایت کی ہے؟ حشرات پروالوں، سنہری مکھیوں، شہد کی مکھیوں کو نازک اندامی کس نے عطا فرمائی ہے جو پھولوں کے بور کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام انجام دیتے ہیں؟ کیوں شہد کی مکھیاں ایک مدت تک خاص قسم کے پھول کا رس چوستی رہتی ہیں؟ عالمِ آفرینش میں پھولوں اور حشرات کی زندگی کا آغاز ایک ہی زمانے میں کس لیے ہوا؟

آیا کوئی شخص کہ جو حد سے زیادہ ضدی ہی کیوں نہ ہو اس بات کا تصوّر کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے یا خود بخود معرضِ وجود میں آگیا ہے؟ یا عقل و خرد سے عاری مادہ یا نیچر اس قدر حیرت انگیز اور تعجّب آور نظام کو وجود میں لایا ہے۔؟ عقلِ سلیم جواب دے گی۔ نہیں، ہرگز نہیں!!

قرآن مجید کا فرمان ہے:

" وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا "

" اور تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو اونچی اونچی ٹٹیاں (اور مکانات پاٹ کر) بناتے ہیں ان میں اپنے چھتے بنا۔ پھر ہر طرح کے پھلوں (کے بور) سے (ان کا عرق) چوس۔ پھر اپنے پروردگار کی

راہوں میں تابعداری کے ساتھ چلی جا۔ "

(سورۂ النحل آیہ ٦٧-٦٨)

(١) پھولوں کا میٹھا رس اور ان کے رنگ اور خوشبو کے کیا فوائد ہیں ؟

(٢) شہد کی مکھی کی زندگی کے عجیب وغریب پہلوؤں سے آپ کس قدر آشنا ہیں ؟

دسواں سبق

نہایت ہی چھوٹی چیزیں

گو کہ ہم کائنات کی حیرت انگیز چیزوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ ہمارا واسطہ معمول کی صورت اختیار کر چکا ہے لیکن ہم ان چیزوں کی اہمیت سے غافل ہیں۔ان اشیاء میں سے چند ایک کا اجمالی تذکرہ بطورِ مثال حاضرِ خدمت ہے۔

۱۔چیونٹی کا مغز

کائنات میں نہایت ہی چھوٹے چھوٹے حیوانات وحشرات ہیں اپنے اردگرد نظر آتے ہیں جن میں سے بعض کی جسامت ایک، دو ملی میٹر سے بھی کم ہوتی ہے لیکن ایک بڑے حیوان کی مانند وہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور کان بلکہ مغز و ہوش اور اعصابی نظام تک رکھتے ہیں۔

اگر ایک چیونٹی کے مغز کو مائیکرواسکوپ کے ذریعہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بناوٹ کس قدر عجیب وغریب اور جاذب نظر ہے۔

اس کے مختلف حصے ہیں جو ایک دوسرے سے منفصل ہیں اور ان میں سے ہر حصے کا اپنا ایک علیحدہ کام ہے جس میں معمولی سی دگرگونی بھی چیونٹی کے بدن کے کسی حصے کے مفلوج ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس کے چھوٹے سے مغز میں جو یقیناً سوئی کی نوک سے بھی زیادہ چھوٹا ہوتا ہے۔ ہوش و ذکاوت، تمدن، ذوق اور ہنر کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ بہت سے ماہرین حیوانیات نے سالہا سال تک اس چھوٹی سی مخلوق پر تحقیق اور مطالعہ کا کام کیا ہے اور اس سے حاصل شدہ حیرت انگیز اور محیر العقول نکات کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

آیا سوئی کی نوک کے برابر ہوش و ذکاوت نہ رکھنے والا مادہ یا طبیعت Nature اس قدر ہوش، ذکاوت اور ذوق ایک نہایت ہی چھوٹی سی مخلوق میں پیدا کر سکتے ہیں؟

۲- ایٹم کی پُراسرار دُنیا

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودات عالم میں چھوٹی سے چھوٹی چیز جو آج تک دریافت کی جا سکی ہے وہ ایٹم اور اس کے اجزا ہیں۔ ایٹم اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ اسے دنیا کے طاقتور ترین مائیکرواسکوپ (جو تنکے کو پہاڑ کی صورت میں دکھا سکتا ہے) کے ذریعہ دیکھنا بھی مشکل ہے۔

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایٹم کس قدر چھوٹا ہوتا ہے؟ تو یوں سمجھیے کہ پانی کے ایک قطرے میں روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوقات کی تعداد سے زیادہ

ایٹم موجود ہیں۔ اور ایک سنٹی میٹر لمبی باریک تار کے "پروٹون" کو شمار کرنے کے لیے اگر ایک ہزار انسانوں کی ڈیوٹی لگائی جائے اور وہ رات دن کام کرتے ہوئے ہر سیکنڈ میں ایک پروٹون کو جدا کریں تو اس کام کے لیے (ایٹمز کی تعداد کے مطابق) تین سے لے کر تین سو سال تک کا عرصہ درکار ہوگا۔

جب ایک سینٹی میٹر لمبی باریک تار میں اس قدر ایٹم موجود ہیں تو اندازہ لگائیے کہ اس زمین و آسمان، آب و ہوا، کہکشاں اور ہمارے منظومۂ شمسی میں کس قدر ایٹم ہوں گے ؟

آیا انسانی فکر ان کو شمار کر سکتی ہے ؟

سوائے اس کے کہ یہ کہیں کہ خالقِ کائنات کے سوا ان کی تعداد سے کوئی واقف نہیں۔

ایٹم توحید کا درس دیتے ہیں

ایٹم شناسی موجودہ دور کا ایک اہم اور دلچسپ ترین موضوع ہے۔ یہ انتہائی چھوٹی سی چیز ہمیں توحید کا درس دیتی ہے۔

ذیل میں ہم ان چار موضوعات کا تذکرہ کریں گے جو ایٹم کی بحث میں سب سے زیادہ توجہ طلب ہیں۔

۱۔ حیرت انگیز نظام

اب تک سو سے زیادہ ایسے عناصر دریافت کیے جا چکے ہیں جن کے الیکٹرونز کی تعداد ایک سے شروع ہو کر سو سے تجاوز کر چکی ہے۔

یہ حیرت انگیز نظام ہرگز ایک بے شعور چیز (طبیعت) کی مخلوق نہیں ہو سکتا۔

۲۔طاقت کا توازن

ہم سب جانتے ہیں کہ برق Electric کی دو مخالف قوتیں (مثبت اور منفی) ایک دوسرے کو جذب کرتی ہیں۔ اسی طرح الیکٹرون جس میں مثبت برقی بار اور پروٹون جس میں منفی برقی بار موجود ہوتا ہے کو بھی ایک دوسرے کو جذب کرنا چاہیے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ الیکٹرون اپنے مرکز (پروٹون) کے گرد گھومنے سے مرکز گریز قوت (قوت دافعہ) کو وجود میں لاتا ہے۔ اس طرح مرکز گریز قوت چاہتی ہے کہ الیکٹرون کو ایٹم کے مرکز سے دور رکھے اور ایٹم کو ٹکڑے ٹکڑے کرے لیکن قوت جاذبہ چاہتی ہے کہ الیکٹرون کو جذب کر کے ایٹم کو مکمل طور پر ختم کرے۔

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایٹم میں کس طرح قوتِ جاذبہ اور قوت دافعہ کے درمیان ہم آہنگی قائم کر دی گئی ہے کہ نہ تو الیکٹران فرار اختیار کر سکتے ہیں اور نہ جذب ہو سکتے ہیں بلکہ ایک توازن کے ساتھ اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آیا ممکن ہے کہ اس توازن کو اندھی اور بہری "طبیعت" نے وجود بخشا ہو؟

یقیناً نہیں!!

▪ ▬ ▪ ▬ ▪ ▬ ▪

۳- ہر ایک کی اپنی راہ

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ بعض ایٹمز Atoms کے متعدد الیکٹران ہوتے ہیں۔ یہ تمام الیکٹران ایٹم کے اندر ایک ہی مدار میں حرکت نہیں کرتے بلکہ ان کے مدار بھی مختلف ہوتے ہیں۔

کروڑوں سال سے یہ الیکٹران اپنے اپنے مدار میں ایک معین فاصلے سے بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں۔ لیکن آج تک ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی تضاد وجود میں نہیں آیا۔

آیا ہر الیکٹرون کو اس کے معین مدار پر برقرار رکھنا اور ساتھ ہی اسے حیرت انگیز طور پر صحیح سمت میں چلانا کوئی آسان بات ہے۔؟

۴- ایٹم کی عظیم طاقت

ایٹم کی عظیم قوت کے اندازے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ۱۹۴۵ء میں میکسیکو کے ایک بے آب و گیاہ صحرا میں ایٹمی تجربہ کیا گیا جس میں ایک بہت چھوٹے سے ایٹم بم کو ایک فولادی ٹاور پر مارا گیا جس نے ایک ہی دھماکے سے اس ٹاور کو پگھلا کر پانی کر دیا۔ جس سے بخارات اٹھے اور ان سے بجلی کی سی کڑک پیدا ہوئی۔ جب ماہرین اس جگہ پر پہنچے تو ٹاور کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔

اسی سال جاپان کے دو شہروں "ناگاساکی" اور "ہیروشیما" پر دو چھوٹے ایٹم بم گرائے گئے۔

ناگاساکی میں ستر ہزار انسانی جانیں تلف ہوئیں اور اتنے ہی افراد

مجروح ہوئے جبکہ ہیروشیما میں تیس ۳۰ سے چالیس ۴۰ ہزار تک افراد ہلاک ہوئے اور اتنے ہی مجروح۔

کیا کائنات کے ایک چھوٹے سے ذرّے "ایٹم" کا مطالعہ اس بات کے لیے کافی نہیں کہ وہ انسان کو اس کے خالق سے آشنا کرے۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں پائے جانے والے ایٹمز کی تعداد سے بھی زیادہ ایسے دلائل موجود ہیں جو خالق کائنات کے وجود پر دالّ ہیں۔

قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ۔

"اور جتنے درخت زمین میں ہیں سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر اس کی سیاہی بنیں اور اس کے (ختم ہونے کے) بعد (اور) سات سمندر (سیاہی ہو جائیں اور خدا کا علم اور اس کی باتیں لکھی جائیں) تو بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

(سورۂ لقمان آیت ۲۷)

؟ سوالات

① — چیونٹیوں کی زندگی کے بارے میں آپ اور کیا جانتے ہیں ؟

② — آیا آپ ایٹم کی ساخت کا ایک نقشہ تختۂ سیاہ پر بنا سکتے ہیں ؟

سبق نمبر دس کی بحث کا تتمہ

خدا کی باعظمت صفات

خدا کی صفات

یاد رہے کہ اسرارِ کائنات کے مطالعہ سے وجود خدا کا یقین حاصل کر لینا جس قدر آسان ہے، خدا کی صفات اور اُن کی پہچان کے سلسلے میں اسی قدر احتیاط اور باریک بینی کی ضرورت ہے۔

یقیناً آپ پوچھیں گے کیوں ؟

اس کا جواب بالکل صاف اور واضح ہے۔ کیونکہ خدا اور اس کی صفات کائنات میں موجود کسی بھی شے کے ساتھ ہرگز مشابہ نہیں ہیں۔ لہٰذا خداوند متعال کی صفات کی پہچان کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مخلوقات کی تمام صفات کو اس ذاتِ مقدس سے "نفی" کیا جائے۔ یعنی اسے اس

محدود عالم طبیعی کی کسی چیز سے تشبیہ نہ دی جائے۔ اور یہیں پہنچ کر بات مشکل ہو جاتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں زیادہ توجہ اور احتیاط کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم جس جہانِ ہستی میں رہ رہے ہیں اس میں ہمارا سروکار ہمیشہ سے مادّہ اور مادیت سے چلا آرہا ہے۔ ہم اس کے ساتھ مانوس ہو چکے ہیں اور ہر چیز کو مادی انداز میں دیکھنے کی اور ہر شے کو مادّی پیمانے پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بالفاظ دیگر جو کچھ ہم نے آج تک دیکھا ہے وہ جسم اور اس کے خواص ہیں۔ یعنی ایسے موجودات جو زمان اور مکان کی حدود میں مقیّد ہیں اور اپنی مخصوص شکل اور صورت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں ایسے خدا کا تصور جو زمان و مکان کی حدود و قیود سے بالاتر ہو بلکہ تمام زمان و مکان کو احاطہ کیے ہوئے ہو اور ہر لحاظ سے لامحدود ہو نہایت ہی دشوار کام ہے اور قدم قدم پر احتیاط کا طالب ہے۔

یہاں پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہم اس بحث میں "خدا کی ذات" کے بارے میں تحقیقات کو بروئے کار نہیں لائیں گے اور نہ ہی اس بات کی کسی کو توقع رکھنی چاہیے۔ کیونکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بحرِ بیکراں کو کوزے میں بند کرنے کی توقع کی جائے۔ یا جیسے ایک بچے کے (جو ابھی شکمِ مادر میں ہے) بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ تمام کائنات کے حالات سے باخبر ہے۔

آیا ایسا ممکن ہے ؟

یہی وہ مقام ہے کہ ایک تھوڑی سی لغزش انسان کو خداشناسی کے صحیح راستے سے ہٹا کر بت پرستی اور مخلوق پرستی کی سنگلاخ وادی میں

دھکیل دیتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہمیں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئیے کہ خدا کی صفات کو مخلوق کی صفات پر ہرگز قیاس نہیں کریں۔

"جمال" اور "جلال" کی صفات

عموماً خدا کی صفات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک "صفاتِ ثبوتیہ" یعنی جو صفات خدا میں پائی جاتی ہیں اور دوسرے "صفاتِ سلبیہ" یعنی جن صفات سے خدا منزّہ و مبرّا ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذاتِ خدا کتنی صفات رکھتی ہے۔ جواباً عرض ہے کہ ایک لحاظ سے صفاتِ خدا اس قدر زیادہ ہیں کہ جن کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ جبکہ دوسری طرف سے ایک صفت میں ہی تمام صفاتِ خدا کا خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے تمام صفات ثبوتیہ کو ایک جملہ میں یوں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

"خدا کی ذات وہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور کمال کی تمام صفتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔"

اور صفاتِ سلبیہ کے بارے میں بھی صرف ایک جملہ کہا جا سکتا ہے:

"خدا کی ذات کسی بھی لحاظ سے ناقص نہیں ہے۔"

لیکن چونکہ کمال و نقص کے کئی درجے ہیں۔ یعنی بے حد کمال اور بیحد نقص۔ اسی لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی بے حد صفات ثبوتیہ ہیں اور بے حد صفات سلبیہ۔ کیونکہ جو کمال متصور ہو سکتا ہے خدا کی ذات اس سے آراستہ ہے اور جو نقص تصور میں آ سکتا ہے خدا کی ذات اس سے پیراستہ ہے،

اس لحاظ سے خدا کی صفاتِ ثبوتیہ اور سلبیہ لا محدود ہیں۔

خدا کی مشہور ترین صفات

خداوندِ عالم کی مشہور ترین صفاتِ ثبوتیہ ذیل کے معروف شعر میں بیان کی گئی ہیں:

عالم و قادر و حی است و مرید و مدرک
ہم قدیم و ازلی پس متکلم صادق

(۱) —— خداوند "عالِم" ہے یعنی ہر چیز کو جانتا ہے۔

(۲) —— وہ "قادر" ہے یعنی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۳) —— وہ "حی" یعنی زندہ ہے کیونکہ موجودِ زندہ وہ ہے جو علم اور قدرت رکھتا ہو، چونکہ خدا علم بھی رکھتا ہے اور قدرت بھی لہٰذا وہ زندہ ہے۔

(۴) —— "مرید" ہے یعنی صاحبِ ارادہ ہے اور اپنے کام میں مجبور نہیں۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے اس کا خاص مقصد اور حکمت ہوتی ہے۔ آسمان اور زمین میں موجود چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس نے حکمت اور مقصد کے بغیر پیدا نہیں کی۔

(۵) —— خدا "مدرک" ہے یعنی تمام چیزوں کا درک رکھتا ہے۔ سب کو دیکھتا، ہر ایک کی آواز کو سنتا اور ہر ایک چیز سے باخبر ہے۔

(۶) —— "قدیم اورازلی" ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اس کے وجود کا نقطۂ آغاز نہیں۔ کیونکہ اس کی ہستی اور وجود کسی دوسرے کے وجود کا محتاج نہیں۔ اسی لحاظ سے وہ ابدی اور جاودانی بھی ہے کیونکہ جو وجود کسی دوسرے وجود کا محتاج نہ ہو اسے زوال اور فنا نہیں ہے۔

(۷) —— خداوند متعال "متکلم" ہے۔ یعنی وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ آواز کی لہروں کو فضا میں ایجاد کر کے اپنے پیغمبروں سے باتیں کرے۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ زبان، لب اور حلق وغیرہ جیسی چیزوں سے منزّہ و مبرّا ہے۔

(۸) —— وہ "صادق" ہے۔ یعنی جو کچھ کہتا ہے سچ اور عین حقیقت ہوتا ہے۔ کیونکہ جھوٹ یا تو جہالت اور نادانی کی وجہ سے بولا جاتا ہے یا کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے۔ لیکن خداوند عالم دانا اور توانا ہے لہٰذا اس کی کوئی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی۔

صفات ثبوتیہ کی طرح صفاتِ سلبیہ بھی ایک شعر میں اکٹھی کی گئی ہیں:

نہ مرکب بود وجسم، نہ مرئی نہ محل
بے شریک است ومعانی، تو غنی دان خالق

(۱) —— "مرکب نہیں" یعنی وہ اجزائے ترکیبی سے پاک ہے۔ کیونکہ مرکب ہونے کی صورت میں وہ اجزار کا محتاج

ہوتا ہے حالانکہ خدا کسی چیز کا محتاج نہیں۔

۲ ——— "جسم" نہیں۔ کیونکہ ہر جسم محدود، متغیر اور فانی ہوتا ہے۔

۳ ——— "مرئی" نہیں ہے یعنی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ اگر دیکھا جائے تو جسم ہوگا جو محدود اور فانی ہے۔

۴ ——— "محل حوادث" نہیں۔ کیونکہ جسم نہیں اور جسم ہی محل حوادث ہوا کرتا ہے۔

۵ ——— "شریک" نہیں رکھتا۔ کیونکہ اگر اس کا کوئی شریک ہو تو محدود ہو جائے۔ چونکہ دو لامحدود وجودوں کا ایک وقت میں ہونا ممکن نہیں ہے۔ نیز کائنات میں وحدتِ قوانین اس کی توحید پر دلالت کرتی ہے۔

۶ ——— "معانی" نہیں رکھتا۔ یعنی اس کی تمام صفات عینِ ذات ہیں اور کوئی صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے۔

۷ ——— خدا "محتاج" نہیں ہے بلکہ غنی اور بے نیاز ہے کیونکہ بے انتہا علم اور قدرت کی مالک ذات میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

خداوندِ عالم فرماتا ہے:

" لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ "

یعنی کوئی چیز اس کی مانند نہیں۔"

(سورہ شوریٰ آیت ۱۱)

؟ سوالات

① آیا خدا کی وحدانیت اور اس کے لاشریک ہونے کی اور بھی دلیلیں آپ کے پاس ہیں؟

② کبھی آپ نے سُنا ہے کہ بعض مذاہب تین خداؤں کے اور بعض دو خداؤں کے قائل ہیں ؟ یہ کون سے مذاہب ہیں۔ ؟

خُدا

ہرگز لوگوں پر ظُلم نہیں کرتا

مگر لوگ

خود ہی اپنے پر

ظلم کیا کرتے ہیں ——— !

سورہ یونس - آیت ۴۴

عَدْل

فہرستِ اسباق

پہلا سبق

عدل

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل موضوعات زیر بحث آئیں گے :

- —— آخر کیا وجہ ہے کہ دوسری تمام صفات خداوندی کو چھوڑ کر صرف " عدل " ہی کو اصولِ دین میں شمار کیا گیا ہے ؟
- —— "عدالت" اور "مساوات" کے درمیان کیا فرق ہے ؟

۱۔ عدل ہی کیوں ؟

اس بحث میں سب سے پہلے اس بات پر روشنی ڈالی جائے گی کہ خداوند عالم کی اور صفات بھی ہیں لیکن صرف "عدل" ہی کو کیوں علمائے اعلام نے اصول پنجگانہ میں شمار کیا ہے ؟

خداوند متعال " عالم " ہے —— " قادر " ہے —— " عادل " ہے

"حکیم" ہے ـــــ "رحمان" و "رحیم" ـــــ اور ـــــ "ازلی" وابدی ہے ـــــ "خالق" ـــــ اور ـــــ "رازق" ہے، لیکن صرف "عدالت" ہی کو اصولِ دین میں شمار کرنے کی کیا وجہ ہے؟

اس اہم سوال کا جواب پانے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر توجہ ضروری ہے۔

- ـــــ خدا کی صفات میں "عدالت" کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ دوسری تمام صفات کا انحصار اسی پر ہے۔ کیونکہ عدالت کا وسیع مفہوم ہے "ہر چیز کو اپنی جگہ پر قرار دینا" بنابریں "حکیم" ـــــ "رازق" ـــــ "رحمان" ـــــ اور ـــــ "رحیم" جیسی صفتیں اس وسیع مفہوم میں آجاتی ہیں۔
- ـــــ "معاد" کا دارومدار بھی عدل پر ہے، انبیاء کی نبوّت اور ائمہ کی امامت بھی مسئلہ عدل سے تعلق رکھتی ہے۔
- ـــــ آغازِ اسلام ہی میں مسئلہ عدل اختلاف کی صورت اختیار کر گیا۔ اہل سنت کا ایک گروہ جسے "اشاعرہ" کہتے ہیں بالکل ہی خدا کے عدل کا منکر ہو گیا اور کہنے لگا: "خدا کے بارے میں "عدل" اور "ظلم" کا تصور ہی بے سود ہے۔ تمام عالمِ ہستی اس کی ملکیت میں ہے اور اسی سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا خدا جو کام بھی کرے وہ عین عدل ہے۔ حتّٰی کہ وہ "حسن و قبح عقلی" کے بھی معتقد نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری عقل اس قابل نہیں ہے کہ کسی نیکی یا بدی کو درک کر سکے۔

اہل سنت کا دوسرا گروہ جسے "معتزلہ" کہتے ہیں اور تمام شیعہ حضرات خدا کی عدالت کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کسی پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔

ان دونوں گروہوں کی علیحٰدہ شناخت کے لیے ایک گروہ کو "عدلیہ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ کیونکہ وہ "عدل" کو اپنے مذہب کی علامت اور اصول دین کا جزء سمجھتے ہیں۔ دوسرے کو "غیر عدلیہ" کہا جانے لگا۔ مذہب شیعہ بھی "عدلیہ" کا ایک جزء ہے۔

مذہب شیعہ نے عدلیہ فرقہ سے اپنی الگ پہچان کے لیے "امامت" کو بھی اصول دین کا جزء قرار دیا۔ بنابریں جب بھی "عدل" اور "امامت" کی بات ہوگی وہ "مذہب شیعہ امامیہ" کا مسلک تصور کیا جائے گا۔

● —— جہاں تک فروع دین کا تعلق ہے وہ درحقیقت اصولِ دین کے پرتو ہیں اور "عدل الٰہی" ہی ایک ایسی اصل ہے جسے عالم بشریت میں غیر معمولی عمل دخل حاصل ہے اور انسانی معاشرہ کی اصل بنیاد ہی "عدالتِ اجتماعی" پر استوار ہے۔ لہٰذا خدا کی دوسری تمام صفات کو چھوڑ کر عدل کو اصولِ دین کے جزء کی صورت میں انتخاب کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی معاشرے میں "عدل" کو رائج اور ہر قسم کے ظلم وستم کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔

جس طرح خداوند عالم کی ہر گونہ توحید یعنی توحید ذاتی، توحید صفاتی،

توحیدِ عبادتی وغیرہ انسانی معاشرے میں وحدت اور اتحاد کی علامت اور صفوف انسانی کو متحد رکھنے کا خاص عنصر ہے۔ اسی طرح عقیدۂ" عدل الٰہی " بھی انسانی معاشرے میں عدل وانصاف کے نافذ کرنے میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔

جس طرح انبیاء اور ائمہ کی قیادت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امتِ مسلمہ کو ہمیشہ حقیقی رہبر کی ضرورت رہتی ہے۔ اسی طرح عدلِ خداوندی جو تمام عالمِ ہستی پر حکم فرما ہے اس بات کا اشارہ ہے کہ انسانی معاشرے میں بھی عدالتِ اجتماعی کا ہونا ضروری ہے۔ اور جس طرح تمام کائنات عدالت کی بنا پر قائم و برقرار ہے اسی طرح عالم انسانیت بھی اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

عدالت کیا ہے؟

عدالت کے دو معنی ہیں۔

ایک وسیع اور عمومی، دوسرے خصوصی۔

الف : جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ " ہر چیز کو اپنی جگہ قرار دینا "، یا دوسرے لفظوں میں ہر چیز کا موزوں اور اپنی مناسب جگہ پر ہونا۔

اور عدالت کا یہ معنی تمام کائنات، تمام شمسی منظوموں، ایٹم کے اندر، انسانی ڈھانچے، اور تمام نباتات وجمادات اور حیوانات میں موجود ہے جیسے کہ حدیث شریف میں بھی اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

" بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضُ "

" عدل ہی کے ذریعے آسمان اور زمین قائم ہیں "

مثال کے طور پر اگر کرۂ زمین کی قوتِ "جاذبہ" اور "دافعہ" اپنا توازن کھو بیٹھے اور وہ ایک دوسرے پر غالب آجائیں تو یا تو زمین سورج کی طرف کھنچ کر اس میں جذب ہوجائے اور جل کر بھسم ہوجائے اور یا اپنے مدار سے نکل کر اس فضائے بیکراں میں نیست و نابود ہوجائے۔

شاعر نے عدل کے اسی معنی کو اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے :

عدل چبود ؟ وضع اندر موضعش
ظلم چبود ؟ وضع درنا موضعش

عدل چبود ؟ آب دہ اشجار را
ظلم چبود ؟ آب دادن خار را

" یعنی: عدل کیا ہے ؟ ہر چیز کا اپنی جگہ رکھنا
اور ظلم کیا ہے ؟ کسی چیز کا غیر مناسب مقام پر رکھنا
عدل کیا ہے ؟ درختوں کو سیراب کرنا
ظلم کیا ہے ؟ کانٹوں کو پانی دینا "

ظاہر ہے کہ اگر سایہ دار اور پھل دار درختوں اور پھولوں کے پودوں کو پانی دیا جائے تو اس کا مصرف بجا اور عین عدالت ہوگا۔ لیکن اگر گھاس پھونس اور بے فائدہ جڑی بوٹیوں کو دیا جائے تو یہ بے جا مصرف اور ظلم ہوگا۔

ب : عدالت کا دوسرا معنی افراد کو ان کے حقوق دینا ہے۔ جس کا الٹ "ظلم" ہے یعنی دوسروں کے حق و حقوق کو چھین کر اپنے پاس رکھ لینا یا کسی اور کو دے دینا یا کسی قسم کا ناروا امتیاز و سلوک قائم کرنا اس لحاظ سے کہ ایک ہی طرح کے حقوق بعض افراد کو دینا اور بعض کو نہ دینا۔

ظاہر ہے کہ عدل کا دوسرا معنی "خاص" اور پہلا معنی "عام" ہے۔

لیکن خداوند عالم کے بارے میں دونوں معانی صادق ہیں۔ ہرچند کہ اس بحث میں ہماری بیشتر مراد دوسرے معنی سے ہے۔

خداوند عالم کی عدالت کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو کسی کے حق کو ضائع کرتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو دبتا ہے اور نہ ہی کسی کے ساتھ ناروا سلوک وامتیاز قائم کرتا ہے۔ وہ تمام معانی کے لحاظ سے عادل ہے۔ اس کی عدالت کے دلائل اگلی بحث میں ذکر کیے جائیں گے۔

"ظلم" خواہ کسی کا حق چھیننے کے معنی میں ہو یا ایک کا حق دوسرے کو دینے اور یا کسی سے امتیازی سلوک روا رکھنے کے، اس کا اطلاق خداوندِ عالم کی ذاتِ پاک پر نہیں ہو سکتا۔

وہ قطعاً کسی نیکوکار کو سزا اور بدکار کو جزا نہیں دیتا۔ کسی کو دوسرے کے گناہ کے جرم میں نہیں پکڑتا اور نہ ہی خشک کو تر کے ساتھ ایک بھٹی میں جلاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک عظیم اجتماع میں صرف ایک شخص نیک ہو اور باقی سب بدکار تو خدا سزا دینے میں اسے الگ کر دے گا۔

اور "اشاعرہ" کا یہ نظریہ کہ اگر خداوند متعال تمام انبیاء کو (نعوذ باللہ) جہنم میں اور تمام بدکاروں کو بہشت میں بھیج دے تو ظلم نہیں ہوگا۔ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے اور اگر تعصب کی عینک اتار کر اس پر صحیح معنوں میں غور و فکر کیا جائے تو عقلِ سلیم اسے کبھی تسلیم کرنے پر تیار نہ ہو گی۔

۲۔ "مساوات" اور "عدالت" میں فرق

یہاں پر ایک انتہائی اہم نکتے کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ

بسا اوقات "عدالت" کو "مساوات" کے معنی سے ملا دیا جاتا ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ عدالت میں مساوات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

حالانکہ ایسا نہیں،

عدالت میں ہرگز مساوات شرط نہیں ہے بلکہ استحقاق اور اولیٰ ہونا ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ایک ہی کلاس کے تمام شاگردوں کے درمیان عدالت کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ سب کو ایک جیسے نمبر دیے جائیں۔

دو مزدوروں کے درمیان عدالت اس کا نام نہیں کہ دونوں کو ایک طرح کی اجرت دی جائے۔ بلکہ عدالت یہ ہے کہ ہر شاگرد کو اس کی معلومات اور قابلیت کے مطابق نمبر دیے جائیں اور ہر مزدور کو اس کے کام اور جفاکشی کے مطابق اجرت دی جائے۔

اس کائنات میں بھی عدالت کو اسی معنی میں لیا جاتا ہے کہ موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک کو اس کے استحقاق، استعداد اور لیاقت کے مطابق حصہ ملتا ہے۔

؟ سوالات

① خدا کی دوسری صفات بھی ہیں لیکن عدل کو علیحدہ اصل کے طور پر کیوں بیان کیا گیا ہے۔

۲ — "اشاعرہ" کون لوگ ہیں اور ان کے عقائد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟

۳ — عدالت کے کتنے معانی ہیں ؟ تفصیل کے ساتھ بیان کریں ؟

۴ — عدلِ الٰہی پر اعتقاد انسانی معاشرے میں کس حد تک مؤثر ہے ؟

۵ — آیا "عدالت" کا معنیٰ "مساوات" ہے ۔

دوسرا سبق

عدلِ الٰہی کے دلائل

۱۔ حسن و قبح عقلی

اس دلیل کو ذکر کرنے سے پہلے ایک مختصر سی تشریح ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہماری عقلیں کسی حد تک چیزوں کی "اچھائی"، یا "برائی" کو سمجھتی ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے علمائے علم کلام "حسن و قبح عقلی"، کا نام دیتے ہیں۔

مثلاً ہم سب جانتے ہیں کہ عدالت اور سخاوت اچھی چیزیں ہیں اور ظلم و بخل بُری۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مذہب ان چیزوں کی اچھائی اور بُرائی بیان نہ بھی کرے پھر بھی ہر ایک کو عدل و سخاوت کی اچھائی اور ظلم و بخل کی بُرائی معلوم ہے۔ (البتہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن تک ہماری عقلوں کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ہمیں انبیاء اور ائمہ کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے)

بنابریں اگر اشاعرہ "حسن وقبح عقلی" کا انکار کرتے ہیں اور اچھائی اور برائی کی شناخت حتیٰ کہ عدالت اور ظلم وغیرہ کے بارے میں بھی مذہب اور شریعت کو اس پہچان کا ذریعہ بتاتے ہیں نہ کہ عقل کو۔

تو یہ ان کی سمجھ کی غلطی ہے۔

کیونکہ اگر ہماری عقل کو اچھائی اور برائی کی سمجھ نہ ہو تو ہمیں یہ کہاں سے معلوم ہوگا کہ خداوند عالم کسی جھوٹے آدمی کو معجزہ عطا نہیں کرتا؟

لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے اور خدا کی ذات سے کسی برائی کا سرزد ہونا محال ہے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ خداوند عالم کے تمام وعدے سچے اور اس کی تمام باتیں صحیح ہیں۔ وہ کسی جھوٹے آدمی کے بازو مضبوط نہیں کرتا اور کبھی بھی جھوٹے شخص کو معجزہ عطا نہیں فرماتا اور اس مرحلے تک پہنچ کر ان چیزوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جو دین اور مذہب میں وارد ہوئی ہیں۔

اب ہم "خدا کی عدالت" کے دلائل بیان کرتے ہیں۔ نیز اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ :

۱۔ ظلم کا سرچشمہ کون سی چیز ہے؟

یاد رہے کہ مندرجہ ذیل وجوہات میں سے کسی ایک کی بنا پر بھی ظلم کیا جا سکتا ہے :

● —— جہالت :

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ظالم شخص کو حقیقتِ حال کا علم نہیں

کہ کیا کرے ؟ تو ایسی صورت میں وہ دوسروں کے حقوق پائمال کرتا ہے اور اسے اپنی اس غلطی کا علم بھی نہیں ہوتا۔

● ــــــ ضرورت:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کے پاس موجود چیز کی انسان ضرورت محسوس کرتا ہے اور اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ چیز زبردستی اس سے لے لی جائے۔ چنانچہ وہ اس شیطانی کام کو انجام دیتا ہے۔ اگر وہ اس چیز کا محتاج و ضرورت مند نہ ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتا۔

● ــــــ عجز اور ناتوانی:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کے حق میں کوتاہی کرے، لیکن یہ کام اس کی طاقت سے باہر ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔

● ــــــ خود غرضی، کینہ اور انتقام:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ تین وجوہات میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہوتی، لیکن خود غرضی اس بات کا سبب ہو جاتی ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے یا کسی سے انتقام لینے کی خاطر اس کے حقوق چھیننے کی کوشش کرتا ہے اگر ایسا بھی نہ ہو تو پھر حسد اور کینہ اسے ظلم پر آمادہ کرتا ہے یا پھر خود خواہی اور ہوسِ اقتدار دوسروں پر ظلم کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

لیکن یہ چیزیں خدا کی ذات میں نہیں ہیں۔ کیونکہ خدا ان تمام ناشائستہ صفات سے پاک اور ہر قسم کی ضروریات سے بے نیاز ہے۔ وہ " عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ " ہے اور ہر ایک پر یکساں مہربان ہے

یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی ظلم کا مرتکب ہو، وہ بے انتہا اور غیر محدود وجود کا مالک ہے۔

کیا ایسے وجود سے خیر و برکت، عدل و انصاف، رحمت و مہربانی کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع کی جا سکتی ہے؟

اگر وہ بدکاروں کو سزا دیتا ہے تو وہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جس کے وہ مرتکب ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی شخص منشیات کے استعمال یا شراب نوشی کی وجہ سے مختلف مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

"وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ"

"اور تمھیں تو اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو دنیا میں کرتے رہے۔" (سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۳۹)

۲۔ قرآن اور عدلِ الٰہی

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید سے بھی اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد رب العزت ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ"

www.kitabmart.in

" خدا تو ہرگز لوگوں پر ظلم نہیں کرتا مگر لوگ خود ہی اپنے پر ظلم کیا کرتے ہیں ۔" (سورہ یونس آیت ۴۴)

ایک اور مقام پر فرماتا ہے :

" اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ "

" خداوند عالم کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا ۔"

(سورۂ نساء آیت ۴۰)

حساب و کتاب اور قیامت کے دن اعمال کی جزا کے بارے میں فرماتا ہے :

" وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا "

" ہم قیامت کے دن عدل کے ترازو قائم کریں گے اور کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں ہوگا ۔"

(سورۂ انبیاء آیت ۴۷)

---

۳ ۔ عدل و انصاف کی دعوت

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ انسان کو خدائی صفات کا آئینہ دار ہونا چاہیے اور انسانی معاشرے میں بھی خدائی صفات جلوہ فگن ہونی چاہئیں اور اسی اصول کی رو سے قرآن مجید نے جس قدر خداوند عالم کی عدالت کے بارے

میں بیان کیا ہے اسی قدر وہ نوعِ انسانی کے ہر فرد اور انسانی معاشرے کے ہر مقام پر عدل و انصاف کا نفاذ دیکھنا چاہتا ہے۔

خداوندِ عالم نے بارہا ظلم کو معاشرے کی تباہی اور بربادی کا سبب بتایا ہے اور ظالموں کو دردناک عذاب سے دوچار ہونے کا پیغام دیا ہے۔

قرآن نے جہاں گزشتہ اقوام کی تباہی کی دردناک داستانیں بتائی ہیں وہاں پر یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ان کی تباہی کا سبب ظلم تھا جس کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوا اور وہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

قرآن مجید ایک بنیادی اصول کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاۗءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ "

" اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور نیکی کرنے اور قرابت داروں کے ساتھ بخشش کا حکم دیتا ہے۔ اور برے کاموں اور ظلم سے روکتا ہے۔"

(سورہ نحل آیت ۹۰)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ جس طرح ظلم کرنا ناشائستہ اور قبیح بات ہے اسی طرح ظلم کا قبول کرنا اور مظالم کا برداشت کرنا بھی اسلام اور قرآن کی رُو سے ناپسندیدہ فعل ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۹ میں خدا فرماتا ہے:

" لَاتَظْلِمُوْنَ وَلَاتُظْلَمُوْنَ "

" نہ کسی پر ظلم کرتے ہو اور نہ ہی کسی کا ظلم برداشت کرتے ہو ۔ "

اصولاً ظالموں کے سامنے ہتھیار ڈالنا ، ظالموں کی ترغیب، ظلم و ستم کے پھیلنے اور ظالم کی اعانت کا سبب بنتا ہے ۔

؟ سوالات

۱ — آیا ہماری عقل مستقل طور پر نیکی اور بدی کو سمجھ سکتی ہے ؟

۲ — ظلم کا سرچشمہ کیا چیز ہے ؟ اور خدا کی عدالت پر کوئی عقلی دلیل پیش کریں ؟

۳ — قرآن ، خدا کی عدالت اور ظلم کی نفی کے بارے میں کیا کہتا ہے ؟

۴ — آیا ظلم کو قبول کرنا اور اس کے آگے سر جھکا دینا بھی گناہ ہے ؟

تیسرا سبق

آفات اور مصائب کا فلسفہ

قدیم ایام سے ہی ناآگاہ اور کم فہم لوگوں کا ایک گروہ خدا کی عدالت پر اعتراض کرتا چلا آرہا ہے اور یہ لوگ ایسے مسائل عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں جو بقول ان کے خدا کی عدالت کے شایانِ شان نہیں۔

بسا اوقات مسائل کو اس طرح بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا عادل نہیں یا جس سے خدا کے وجود ہی کی نفی ہوتی ہے۔

منجملہ ان مسائل کے طوفان، زلزلے اور ان جیسے دوسرے ناگوار حادثات ہیں یا انسانی معاشرے میں جو امتیازات دیکھنے میں آتے ہیں اسی طرح آفاتِ ارضی وسماوی جو انسان اور دوسری مخلوقات پر نازل ہوتی ہیں ان لوگوں کی گفتگو کا محور ہوتی ہیں۔

یہ بحث یا تو خدا شناسی کے ضمن میں مادہ پرستوں کے ساتھ انجام پاتی ہے

اور یا خود پروردگار کے بارے میں۔ لیکن ہم اسے یہاں بیان کرتے ہیں اور مطلب کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر توجہ دیتے ہیں۔

۱۔ محدود معلومات کے ضمن میں فیصلہ

عموماً ہم جب کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرتے ہیں یا کسی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مطابقت دیتے ہیں تو یہ اس رابطے کی بنا پر ہوتا ہے جو وہ چیزیں ہمارے ساتھ رکھتی ہیں یا ان کی آپس میں جو نسبت ہوتی ہے۔

مثلاً اپنے سے فاصلے کی بنا پر کہتے ہیں کہ فلاں چیز نزدیک ہے یا دور ہے۔ یا اپنی روحانی یا جسمانی حالت کی بنا پر کہتے کہ

فلاں آدمی طاقتور ہے یا کمزور ہے۔

خیر و شر اور آفات و بلیات کے بارے میں بھی لوگوں کا عموماً یہی فیصلہ ہوتا ہے۔

مثلاً کسی علاقے میں بارش ہوتی ہے تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ مجموعی طور پر اس کا کیا اثر ہوا ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی، مکان، زراعت یا زیادہ سے زیادہ ہمارے شہر پر اس کا کیا اثر ہوا ہے؟

اگر مثبت اثر ہوا ہے تو کہتے ہیں کہ "رحمت" تھی۔ اور اگر منفی ہوا ہے تو کہتے ہیں کہ "مصیبت" تھی۔ اگرچہ مجموعی طور پر اس کے اچھے اثرات ہی کیوں نہ ہوں؟

جب کسی پرانی اور بوسیدہ عمارت کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے گراتے ہیں اور ایک راہگذر کی حیثیت سے اگر ہمارا وہاں سے گزر ہو تو گرد و غبار سے

دوچار ہونے کی بنا پر ہم فوراً کہہ دیتے ہیں کہ کیسا بُرا ہوا ہے؟ اگرچہ بعد میں اس جگہ پر ہسپتال ہی کیوں نہ تعمیر کیا جائے جس سے لاکھوں مریضوں کو فائدہ پہنچے گا۔

ہم ظاہری طور پر "سانپ کے ڈنک" کو آفت اور شر سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ اس کے لیے موثر دفاع کا ایک ذریعہ ہے اور بسا اوقات اس کی زہر سے ایسی دوائیں بھی تیار کی جاتی ہیں جو ہزاروں انسانوں کی جان بچانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

بنابریں اگر ہم غلط نتائج حاصل کرنے سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی محدود معلومات کو نہ دیکھیں اور کسی چیز کے متعلق فیصلہ دینے کے لیے اپنے ساتھ رابطے یا نسبت کو مدنظر نہ رکھیں بلکہ قضیے کے تمام پہلوؤں کو اپنے سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ دیں۔

دراصل دنیاوی حادثات زنجیر کی کڑیوں کی مانند ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ مثلاً آج جو طوفان ہمارے شہر میں آیا ہے اور کل جو طوفانی بارشیں ہوں گی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جو دوسرے علاقوں کے حوادث سے ملی ہوئی ہیں۔ اسی طرح جو حادثات گزشتہ دنوں پیش آئے ہیں ان حوادث سے باہم مربوط ہیں جو کل پیش آئیں گے۔ لہٰذا حوادث کے ایک چھوٹے سے حصے کو سامنے رکھ کر اور بہت بڑے حصے سے چشم پوشی کر کے فوراً فیصلہ دے دینا عقل اور منطق کے خلاف ہے۔

البتہ "شرِ مطلق" یعنی جو سب کا سب شر ہو اور خیر کا کوئی بھی پہلو اس میں نہ پایا جائے یہ تو قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن جس میں شر کا پہلو کم اور خیر کا حصہ زیادہ ہو تو یہ ایک عملِ جراحی کی مانند ہے کہ جو معمولی تکلیف کے بعد زیادہ راحت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ہم زلزلے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے

کہ زلزلہ ایک لحاظ سے ایک نقصان دہ چیز ہے ۔ اس سے تباہی اور ویرانی وجود میں آتی ہے لیکن اس کے دوسرے مسائل کے ساتھ مسلسل رابطے کو بھی تو دیکھنا ہوگا جس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارا نظریہ بدل جائے ۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

آیا زلزلے کا تعلق زمین کے اندرونی بخارات اور حرارت سے ہوتا ہے ؟ یا چاند کی کشش کے ساتھ جو زمین کو اپنی طرف کھینچ رہی ہوتی ہے ؟ یا دونوں سے اس کا تعلق ہے ؟

اس بارے میں ماہرین کے مختلف نظریے ہیں ۔

سبب خواہ کچھ بھی ہو اس کے دوسرے اثرات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا ۔ یعنی ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ زمین کی اندرونی حرارت موجودہ دور میں طاقت کے اہم ترین عامل تیل کے ذخائر ایجاد کرنے میں کس قدر مؤثر ہے ؟ اسی طرح پتھر کے کوئلے اور اس قسم کی دوسری نہایت مفید اشیاء کی ایجاد سے اس حرارت کا کیا تعلق ہے ؟

نیز چاند کی وجہ سے سمندر میں پیدا ہونے والا مدوجزر، سمندر کے پانی اور اس میں موجود دیگر مخلوقات کو زندہ رکھنے اور اس کے خشک ساحلوں کی آبپاشی میں کس قدر مؤثر ہے ؟

ایک لحاظ سے یہ بھی خیر ہوا ۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یکطرفہ فیصلہ اور محدود معلومات ہیں جو ان مسائل کے تاریک پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں ۔ لیکن جس قدر ہم حادثات کے باہمی تعلق پر غور کریں گے تو حقائق سے مزید پردہ اٹھتا چلا جائے گا ۔

قرآن مجید ہمارے علم و دانش کے متعلق فرماتا ہے :

"وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا" (سورہ اسراء آیت ۸۵)

" علم و دانش سے تمھیں کم ہی حصہ ملا ہے ۔ "

---

۲ - حوادث اور تنبیہ

عموماً ہم سب جانتے ہیں بلکہ اکثر اوقات دیکھا ہے کہ جن لوگوں کو نعمتیں ملی ہوتی ہیں اور وہ ان میں غرق ہوتے ہیں تو یہ عمل انھیں غرور اور تکبّر میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس طرح کے لوگ بہت سے انسانی مسائل حتّٰی کہ اپنے فرائض سے بھی غافل ہو جاتے ہیں ۔

نیز ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب او قیانوس زندگی میں ٹھہراؤ آجائے اور اسے مکمل عیش و آرام حاصل ہو جائے تو "خواب غفلت" ان پر طاری ہو جاتا ہے اور اگر یہی حالت برقرار رہے تو انسان شقاوت اور بدبختی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے ۔

یقیناً بعض ناخوشگوار حالات انسان کو غرور اور تکبر سے نجات دلانے اور اسے خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں ۔

یقیناً آپ نے سنا ہو گا کہ تجربہ کار ڈرائیوروں کو بھی صاف اور سیدھے راستے سے شکایت رہتی ہے اور وہ ان راستوں کو خطرناک سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ اس طرح کے راستے میں انھیں جلد نیند آجاتی ہے جو ڈرائیور کے لیے بہر صورت خطرناک ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ملکوں میں اس قسم کے راستوں پر مصنوعی نشیب و فراز

اور رکاوٹیں بنائی جاتی ہیں تاکہ حادثات کا سد باب کیا جاسکے۔

انسانی زندگی کا راستہ بھی بعینہ اسی طرح ہے۔ اگر زندگی کے راستے میں نشیب و فراز اور رکاوٹیں نہ ہوں اور ناخوشگوار حادثات پیش نہ آئیں تو انسان اپنے خدا سے مکمل طور پر غافل اور بے خبر ہوجائے۔ اپنے انسانی، اخلاقی اور شرعی فرائض اور ذمہ داریوں کو یکسر بھول جائے۔

ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ انسان اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے لیے ناخوشگوار حادثات و حالات پیدا کرے، اور تکالیف کا سامنا کرے،

بلکہ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ انسان کو ان حوادث کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ بسا اوقات یہی حوادث انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں اور سعادت اور خوش بختی کا سبب یا موجب عبرت بن جاتے ہیں۔

اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ بعض ناخوشگوار حوادث ایسے ہوتے ہیں، سب کے سب نہیں۔ کیونکہ کچھ حوادث ایسے بھی ہیں جن کا فلسفہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔

خداوند عالم نے عظیم آسمانی کتاب (قرآن مجید) میں اس سلسلے میں یوں فرمایا ہے:

"فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ"

"ہم نے انھیں سخت دردناک حوادث اور رنج و غم میں مبتلا کر دیا ہے تاکہ وہ خدا کی طرف متوجہ ہوں۔"

(سورۂ انعام آیت ۴۲)

؟ سوالات

۱۔ آفات اور مصائب کی کچھ مثالیں بیان کیجیے اور بتائیے کہ زندگی میں آپ کا بھی کبھی ان سے سامنا ہوا ہے ؟

۲۔ "نسبت کے لحاظ سے فیصلہ" سے کیا مراد ہے ؟ "شر مطلق" اور "نسبتاً خیر" سے کیا مراد ہے ؟

۳۔ آیا طوفان اور زلزلے صرف نقصان ہی پہنچاتے ہیں ؟

۴۔ زندگی میں پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات انسانی زندگی میں کیا مثبت نفسیاتی اثرات چھوڑ سکتے ہیں ؟

چوتھا سبق

ناخوشگوار حوادث کا فلسفہ

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بعض معترض قسم کے لوگ انسانی زندگی میں ناخوشگوار حوادث، آفات و مشکلات اور ناکامیوں کو خدا کی عدالت سے انکار بلکہ بسا اوقات خود خدا کے وجود سے انکار کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔

گزشتہ سبق میں ہم نے بعض حوادث کو موضوع بحث بنایا تھا اور اب کچھ اور حوادث پر بحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔

۳۔ انسان مشکلات کی آغوش میں پروان چڑھتا ہے:

ایک بار پھر ہم اس بات کو دہراتے چلیں کہ انسان کو اپنے ہاتھوں سے کوئی مشکل یا حادثہ ایجاد نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سخت

سے سخت اور ناخوشگوار ترین حوادث ہمارے ارادے کو قوی اور ہماری طاقت کے بڑھانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح جیسے سونا آگ میں پڑنے سے کندن بن جاتا ہے، ایسے ہی ہم حوادث کی بھٹی میں پڑ کر قوی ارادہ کے مالک اور طاقت ور بن جاتے ہیں۔

جنگ بذاتہ کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سخت اور طویل جنگ کسی قوم کی استعداد کو بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے انتشار کو وحدت میں تبدیل اور پسماندگیوں کو دور کر دیتی ہے۔

ایک معروف مغربی مؤرخ کہتا ہے:

"تاریخی لحاظ سے دنیا کے کسی بھی گوشے میں اگر روشن تمدن کا ظہور ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ملک کسی بڑی غیر ملکی طاقت کی یلغار کا نشانہ بنا اور اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور قوم کو ایک لڑی میں پرو دیا۔"

البتہ ان سختیوں کے مقابلے میں تمام لوگوں کا ردعمل ایک سا نہیں ہوتا کچھ تو ناامیدی، بزدلی اور کم ہمتی کا شکار ہو کر منفی نتیجہ حاصل کرتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو متحرک اور فعّال بن جاتے ہیں اور ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اپنی کمزوریوں کی تلافی کر لیتے ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو سطحی فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ صرف تلخیوں، سختیوں اور ناخوشگواریوں کو تو دیکھتے ہیں لیکن اس کے تعمیری اور مثبت پہلو پر غور نہیں کرتے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ زندگی کے تمام تلخ اور ناخوشگوار حوادث انسان کے اندر اسی قدر مؤثر واقع ہوتے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ اثرات ضرور پیدا کرتے ہیں۔

اگر آپ دنیا کے عظیم اور نابغۂ روزگار لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ سب مشکلات اور ناخوشگوار حالات میں پروان چڑھے ہیں۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ نازوں کے پلے افراد نابغہ ہوئے ہوں یا کسی اہم عہدے پر پہنچے ہوں۔

اعلیٰ فوجی کمانڈر وہ ہوتے ہیں جنھوں نے سخت اور طویل میدانِ جنگ دیکھے ہوں۔

اقتصادی میدان میں وہ لوگ اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں جو اقتصاد کے بحرانی بازار سے گزر چکے ہوں۔

زبردست اور اونچے درجے کا سیاستدان وہ ہوتا ہے جو سخت سیاسی مشکلات میں گرفتار ہو چکا ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ:

"رنج وغم اور مصائب و مشکلات انسان کو اپنی گود میں پروان چڑھاتے ہیں۔"

خداوندِ عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا"

"بسا اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو، لیکن

خداوندِ عالم اس میں بہت ہی بھلائی قرار دیتا ہے۔" (سورہ نساء، آیت ۱۹)

۴۔ مشکلات، خدا کی طرف متوجہ کرتی ہیں:

ہماری زندگی کا ایک ایک لمحہ اور بدن کا ہر ایک عضو کوئی نہ کوئی مقصد رکھتا ہے، آنکھ کا اپنا کام ہے اور کان کا اپنا۔ اسی طرح دل، دماغ اور دوسرے اعصاب کا اپنا اپنا ایک ھدف ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ انگلی کے پوروں بلکہ لکیروں کا بھی ایک خاص مقصد اور فلسفہ ہے۔

جب بدن کے ایک ایک جزء کا ایک خاص ھدف اور مقصد ہوتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارا پورا جسم، ھدف، مقصد اور فلسفے سے خالی ہو؟

اور یہ ھدف تمام میدانوں میں انسان کے درجۂ کمال تک پہنچنے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ انسان اس درجے تک اس وقت تک پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک صحیح تعلیم و تربیت اس کے رگ و ریشے میں سرایت نہ کر جائے اور یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے توحید کی پاک فطرت کے علاوہ عظیم الشان پیغمبروں کو آسمانی کتابیں دے کر بھیجا ہے تاکہ انسان کی راہ راست کی طرف راہنمائی کریں۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے کبھی کبھی گناہوں اور لغزشوں کا ردعمل بھی انسان پر ظاہر ہونا چاہیئے اور خداوند عالم کی نافرمانی کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی کے دوران ہی مشکلات اور مصائب سے دوچار ہو۔

تاکہ وہ اپنے ناشائستہ اور بُرے اعمال سے آشنا ہو کر اپنے خالق و مالک کی طرف توجّہ کرے۔

اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ بعض ناگوار حوادث، درحقیقت خدا کی رحمت اور اس کی نعمت ہوا کرتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ"۔

"خشکی اور سمندروں میں لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد ظاہر ہو گیا تاکہ خداوند عالم لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا نتیجہ دکھائے شاید وہ بیدار ہو کر اپنے رب کی طرف پلٹ آئیں۔"

(سورۂ روم۔ آیت ۴۱)

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں آفات اور مصائب کو "شر" اور "بلا" کہنا اور انھیں عدلِ الٰہی کے خلاف تعبیر کرنا عقل اور منطق سے دُور ہے۔ کیونکہ ہم جس قدر ان مسائل کی گہرائیوں میں جائیں گے اسی قدر ان کے فلسفے سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہوں گے۔

؟ سوالات

① ہماری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کی کیا دلیل ہے؟

② انسان مشکلات سے عہدہ برآ ہو کر کس طرح کندن بن کر نکلتا ہے؟

③ آیا آپ نے کسی شخص کو دیکھا ہے یا کسی کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ سختیوں میں پل کر بڑا ہوا ہو اور بلند مرتبے پر جا پہنچا ہو؟ تفصیل سے بیان کریں۔

④ قرآن مجید ہمارے گناہوں کے ردعمل کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

⑤ ناگوار حوادث سے کون لوگ مثبت نتیجہ اور کون لوگ منفی نتیجہ حاصل کرتے ہیں؟

پانچواں سبق

مصائب اور آفات کا فلسفہ

جہاں تک آفات و مصائب اور ناگوار حوادث کا تعلق ہے یقیناً یہ ایک بہت بڑی مشکل ہیں لہٰذا اس مسئلہ پر ہم ایک اور بحث بھی کریں گے۔

مشکلات اور نشیب و فراز، زندگی کی رُوح ہیں:

اس بات کو سمجھنا شاید بعض افراد کے لیے مشکل ہو کہ اگر نعمتیں اور خوشیاں اپنے حال پر باقی رہیں تو وہ اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔

آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اگر کسی گول جسم کو ایک گول کمرے کے درمیان رکھ دیں اور اس کے چاروں طرف روشنی کے طاقتور بلب جلا دیے جائیں

تو وہ جسم ہرگز نظر نہیں آئے گا۔ کیونکہ روشنی کا پرتو ہی ہمیشہ کسی جسم کے طول ، عرض اور عمق کو متعین کرتا ہے جس کی وجہ سے ہم اسے (جسم کو) دیکھ سکتے ہیں۔

نعماتِ زندگی کی صحیح قدر و قیمت، مشکلات کے کم یا زیادہ سایہ کے بغیر ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی۔

اگر بیماری کا وجود نہ ہوتا تو تندرستی کی قدر کوئی نہ جان سکتا۔ ایک رات کا زبردست دردِ سر اور سخت بخار جو تمام رات انسان کو بے چین کر دے اور صبح کو ٹھیک ہو جائے تو ایسی سلامتی کا مزا انسان کے ذائقے کو اس قدر شیریں کر دیتا ہے کہ جب بھی اسے وہ دردناک رات یاد آجاتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ "سلامتی" نام کی کوئی چیز بھی اس کے پاس ہے۔

درحقیقت ایک جیسی زندگی ——— حتیٰ کہ عیش و عشرت کی زندگی ، تھکا دینے والی ، بے جان اور پژمردگی کی زندگی ہوتی ہے۔

عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے لوگ عیش و آرام اور مکمل راحت کی زندگی سے اکتا کر خودکشی کر لیتے ہیں یا ہمیشہ اس زندگی سے نالاں رہتے ہیں۔

کوئی باذوق معمار بہت بڑے ہال کی دیواروں کو جیل خانے کی دیواروں کی مانند سیدھا نہیں بناتا۔ بلکہ پیچ و خم اور نشیب و فراز کے ذریعے ان میں دلکشی پیدا کرتا ہے۔

عالمِ فطرت اس قدر کیوں زیبا اور جاذب نظر ہے ؟

پہاڑوں پر اگنے والے جنگل ، اور پیچ و خم کھانے والے ندی نالے اور دریا جو چھوٹے بڑے درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرتے ہیں اس قدر کیوں جاذب نظر اور دلکش ہوتے ہیں ؟

اس کی ایک روشن دلیل عدم یکسانیت ہے۔

"نور" و "ظلمت" کا نظام اور دن، رات کی آمد و رفت قرآن مجید میں جس کا بیان بارہا آیا ہے، ان کا ایک اہم اثر انسان کی ایک جیسی زندگی میں تبدیلی لانا ہے۔

کیونکہ اگر سورج ہمیشہ آسمان کے ایک حصے میں ایک جیسی حالت میں چمکتا رہتا تو نہ تو کسی قسم کی تبدیلی کا سوال پیدا ہوتا اور نہ ہی رات کا سیاہ پردہ عالم دنیا پر چھاتا۔ غرض تھوڑے سے عرصے میں تمام انسان ایسی زندگی سے تنگ آجاتے۔

بنا بریں یہ بات ماننی پڑے گی کہ زندگی کے بعض مصائب و مشکلات کا کم از کم یہ فلسفہ ہے کہ وہ (مصائب و مشکلات) انسان کی باقی زندگی کو شیریں اور برداشت کے قابل بناتے ہیں۔ نعمتوں کی قدر و قیمت کو آشکار کرتے ہیں اور انسان کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ وہ موجودہ نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔

خود ساختہ مصائب

اس مرحلہ پر پہنچ کر ایک نکتے کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ بہت سے لوگ ناگوار مصائب اور جانکاہ حوادث کے اسباب کا اندازہ لگاتے وقت ایک زبردست غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جو مظالم ستمگار لوگوں کے ذریعے دوسرے افراد پر ڈھائے جاتے ہیں اسے خالق کائنات کی جانب منسوب کر دیتے ہیں۔ اور انسانی کاموں کی بدنظمی کو خداوند عالم کے کاموں پر محمول کر دیتے ہیں۔

مثلاً کبھی وہ اعتراض کرتے ہیں کہ:

"نزلہ برعضو ضعیف" آخر کیوں ؟ زلزلے شہروں میں کم اور دیہاتوں میں زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ آخر کس لیے ؟ یہ کیسی عدالت ہے کہ کچی آبادی کے مکینوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ اگر مصیبتیں نازل ہوتی ہیں تو سب پر ایک جیسی نازل کیوں نہیں ہوتیں۔ کسی پر کم اور کسی پر زیادہ، یہ کیسا انصاف ہے ؟

ہمیشہ دردناک حوادث کی تیز دھار کا رُخ غریبوں ہی کی طرف کیوں ہوتا ہے ــــــــ ؟

غریب لوگ ہی کیوں عموماً بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں ؟

انھیں یہ معلوم نہیں کہ مذکورہ اعتراضات میں سے کسی ایک کا بھی خدا کی ذات سے تعلق نہیں ہے بلکہ یہ سب نتیجہ ہے ایک انسان پر دوسرے انسان کے ظلم، استعمار اور استثمار کا۔

اگر شہریوں کی طرف سے دیہاتیوں پر ظلم نہ ہوا اور وہ محرومیت اور فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوں اور وہ بھی شہریوں کی طرح اپنے پکے اور پختہ مکانات تعمیر کریں تو زلزلے میں ان کا اس قدر جانی اور مالی نقصان نہ ہو !

لیکن جب ان کے مکانات گل گارے اور لکڑیوں سے اس طرح بنائے گئے ہوں جس میں سیمنٹ چونے اور پکی اینٹوں کا نام و نشان تک نہ ہو اور ہوا کے ایک ہی جھونکے یا زمین کی خفیف سی حرکت سے زمین پر دھڑام سے گر پڑیں تو زلزلے کے موقع پر ایسے مکانات سے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے ــــــــ ؟

اور اس کا خدا کے کاموں سے کیا تعلق ہے ؟

ہمیں خدا پر اس شاعر کی طرح تنقید نہیں کرنی چاہیئے کہ:

" ایک (گروہ) کو تو تُو نے ہزاروں نعمتیں دی ہیں

جبکہ دوسرے (گروہ) کو ذلت کی زندگی۔ ایک
کو محل اور دوسرے کو جھونپڑی! یہ کہاں کا
انصاف ہے؟"

ایسی تنقیدوں کا نشانہ سماج کے غلط اور غیر موزوں نظام کو بنانا چاہیے۔ اجتماع کی بے انصافیوں اور سماج کے غلط نظام کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

محرومیوں اور غربت کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا چاہیے۔!
غریب اور مستضعف عوام کے حقوق، مستکبرین سے واپس لینے چاہئیں۔

اگر ایسا ہو جائے تو اس قدر نقصانات بھی معرضِ وجود میں نہ آئیں۔ اگر معاشرے کے تمام افراد کو صحیح غذا ملے۔ کافی طبی سہولتوں سے بہرہ مند ہوں تو بہت سی بیماریوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

لیکن جب معاشرے کا نظام اس حد تک بگڑا ہوا ہو کہ ایک قسم کے افراد کو اس قدر سہولیات فراہم ہوں کہ ان کے کتے اور بلیوں تک کے لیے خصوصی ڈاکٹر ہوں اور دوسرے قسم کے لوگوں کے معصوم بچوں تک کے لیے ابتدائی طبی امداد فراہم نہ ہو تو خدا کی ذات پر اعتراض اور تنقید کرنے کی بجائے ہمیں خود پر اعتراض کرنا چاہیے۔

ظالم سے کہیں کہ کسی پر ظلم نہ کرے، مظلوم سے کہیں کہ کسی کا ظلم نہ سہے ——!

ہمیں مل کر کوشش کرنی چاہیے کہ معاشرے کے تمام افراد کم از کم طبی، غذائی، ثقافتی، تعلیمی، تربیتی اور رہائشی سہولتوں سے بہرہ مند ہوں، اور ہمیں انسانوں کے گناہ، خدا کی ذات سے منسوب کرنے کی بجائے معاشرے کی اصلاح

کرنی چاہئیے۔

خدا نے کب ہمیں ایسی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے ؟ اور کب ایسی زندگی ہمارے اوپر مسلّط کی ہے ؟

اس نے ہمیں آزاد خلق فرمایا ہے۔ اور یہی آزادی انسانی کمال اور ترقی کی علامت ہے۔ لیکن ہم انسانوں نے اس آزادی سے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں۔ دوسروں پر ظلم وستم روا رکھے ہیں جس کے نتیجے میں معاشرتی ناہمواریاں اور دشواریاں معرض وجود میں آتی ہیں۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں یہاں تک کہ اس کے نمونے مشہور شعراء کے اشعار میں بھی ملتے ہیں لیکن قرآن مجید نے ایک مختصر سے جملے میں نہایت ہی مفید اور پر معنی مطالب بیان کیے ہیں۔ فرماتا ہے :

" إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ " (سورہ یونس آیت ۴۴)

" خداوند عالم کسی پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم وستم روا رکھتے ہیں "

؟ سوالات

۱۔ زندگی کی یکساں حالت کے کیا نقصانات ہیں ؟ آیا آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جسے اپنی آرام دہ زندگی سے شکوہ ہو؟

۲۔ عالمِ خلقت میں " نور وظلمت " کے فلسفہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟

۳۔ آیا انسانی معاشرے میں موجود تمام ظلم وستم اور مشکلات نظامِ تخلیق سے مربوط ہیں یا ہمارا بھی اس میں کوئی ہاتھ ہے؟

چھٹا سبق

جبر اور اختیار

منجملہ اور مسائل کے "جبر اور اختیار" ایسے مسئلے ہیں جن کا خدا کی عدالت سے گہرا تعلق ہے۔

کیونکہ "جبریوں" کے عقیدے کے مطابق انسان اپنے ہر طرح کے اعمال، رفتار اور گفتار میں مکمل طور پر بے اختیار ہے۔ اس کے اعضار کی حرکات کسی گاڑی یا کارخانے کے پرزوں کی حرکت کی مانند ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

یہ عقیدہ "عدل الٰہی" سے کیونکر تعلق رکھتا ہے؟

شاید اسی دلیل کی بنا پر "اشاعرہ" کا گروہ (قبلاً جس کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے کہ جو "حسن و قبح عقلی" کا انکار کرتے ہیں) جبر کا قائل اور عدالت کا منکر ہے۔ کیونکہ جبر کو قبول کر لینے سے لازماً عدالت کا انکار

کرنا پڑتا ہے۔
اس بحث کی وضاحت کے لیے ہمیں مجبوراً چند موضوعات پر مفصل گفتگو کرنی پڑے گی۔

۱۔ عقیدۂ جبر کی بنیاد

ہر شخص اپنے اندر احساس رکھتا ہے کہ وہ فیصلہ کرنے کے بارے میں آزاد ہے۔
مثال کے طور پر اپنے دوست کی فلاں مادی امداد کرے یا نہیں؟
یا جبکہ پانی بھی اس کے پاس موجود ہو اور وہ پیاسا بھی ہو یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہے کہ پانی پیے یا نہیں؟
یا فلاں شخص نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اسے بخش دے یا نہیں ـــــــ؟
یا یہ کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں کے درمیان کہ جن میں سے ایک بیماری کی وجہ سے لرزتا ہے اور دوسرا صحیح و سالم ہے اور ارادے و اختیار کے ساتھ حرکت کرتا ہے، فرق جانتا ہے۔
باوجودیکہ ارادے کی آزادی انسان کا ایک عمومی احساس ہے تو پھر ایک گروہ "جبر" کا کیوں قائل ہوگیا ہے؟
اگرچہ اس کے بہت سے دلائل ہیں لیکن ہم ایک اہم ترین دلیل کا یہاں ذکر کرتے ہیں:
اور وہ یہ ہے کہ:

انسان سمجھتا ہے کہ ماحول کا اثر انسانی معاشرے میں بڑی حد تک مؤثر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ایک اور مؤثر عامل ہے۔

افواہیں، پروپیگنڈے اور اجتماعی ثقافت بھی بلاشبہ انسان کی فکر اور روح میں کافی حد تک موثر ہیں۔

بسا اوقات اقتصادی صورت حال بھی موثر واقع ہوسکتی ہے یسا تھ ہی وراثت بھی بہت ہی موثر ثابت ہوتی ہے۔

جب یہ تمام امور مل جائیں تو اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ انسان خیال کرنے لگتا ہے کہ وہ از خود کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتا۔ بلکہ انسان کے اندرونی اور بیرونی اسباب اکٹھے ہوکر اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ ہم مختلف قسم کے فیصلے کر لیتے ہیں اور اگر یہ عوامل نہ ہوتے تو ممکن ہے ہم اس قسم کے فیصلے نہ کر پاتے۔

یہ ایسے امور ہیں جنھیں ہم، "ماحول کا جبر" ——— "اسباب کا جبر" ——— "تعلیم و تربیت کا جبر" ——— اور ——— "وراثت کا جبر" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔

۲۔ جبریوں کی غلط فہمی

جو لوگ اس طرح کی فکر کرتے ہیں وہ درحقیقت ایک بنیادی نکتے سے غافل ہیں۔ اور وہ یہ کہ:

بحث "اسباب" اور "علت ناقصہ" کے بارے میں نہیں بلکہ "علت تامہ" کے بارے میں ہے۔

بالفاظِ دیگر کوئی شخص "ماحول"۔۔۔۔۔"ثقافت"۔۔۔۔۔اور "اقتصادی" عوامل کا منکر نہیں۔ یقیناً یہ چیزیں انسان کے افکار و اعمال میں مؤثر ہیں لیکن اصل بحث اس بارے میں ہے کہ ان تمام اسباب اور عوامل کے باوجود آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہے؟

ظاہر ہے کہ ہمارے ہاتھ میں۔

کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ گزشتہ مخرب اخلاق پہلوی کے طاغوتی نظامِ حکومت میں کوئی شخص مجبور نہ تھا کہ راہ راست سے بھٹک جائے۔ جبکہ اس زمانے میں ہر طرح کے اخلاقی جرائم کے لیے راہ ہموار تھی۔ اس دور میں بھی انسان با اختیار تھا کہ رشوت نہ لے۔ فحاشی کے مراکز میں نہ جائے۔ مذہبی حدود و قیود سے آگے قدم نہ بڑھائے۔

بنا بریں ان "اسباب" کو "علتِ تامّہ" نہیں سمجھنا چاہیئے یا دوسرے لفظوں میں "راستے کی ہمواری" کو "اصل سبب" نہیں جاننا چاہیے۔

اسی دلیل کی بنا پر بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو نہایت ہی پست اور گندگی سے آلودہ ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ یا غیر مناسب میراث کے وارث ہوئے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی صحیح راہ کا انتخاب کیا اور ماحول سے جدا ہو گئے۔

بلکہ کبھی کبھی تو اسی ماحول کے خلاف بھرپور آواز بلند کی حتیٰ کہ انقلاب برپا کیا۔

اور اگر بنیاد یہ ہو کہ انسان ماحول، ثقافت اور پروپیگنڈا وغیرہ کے تابع ہوتا ہے تو دنیا میں کوئی بھی بنیادی انقلاب برپا نہ ہوتا۔ سب کو معاشرے کے رنگ میں رنگ جانا چاہیے تھا۔ اور وہ نیا معاشرہ تشکیل نہ دے پاتے۔

یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ اسباب میں سے کوئی بھی اصلی اور اہم سبب نہیں ہے۔ جو کچھ ہے انسان کا اپنا ارادہ اور اپنا قطعی فیصلہ ہی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ ہم جون جولائی کی زبردست گرمی میں اس بات کا تہیہ کر لیتے ہیں کہ خدا کے حکم کی بجا آوری کے لیے روزہ رکھیں گے۔ چنانچہ روزہ رکھ لیا۔

ہمارے وجود کا ایک ایک ذرہ پانی مانگ رہا ہوتا ہے لیکن ہم فرمانِ حق کی اطاعت کے لیے سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں جبکہ ایک دوسرا انسان ممکن ہے کہ ایسا نہ کر سکے۔

پس ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انسان کی تقدیر بنانے میں اہم ترین سبب اور اصلی عامل اس کا اپنا ارادہ اور اختیار ہے۔

جبر کے اجتماعی اور سیاسی عوامل

حقیقت یہ ہے کہ طول تاریخ کے دوران "جبر" اور "اختیار" کے نام پر بہت سے ناجائز مفادات حاصل کیے گئے ہیں اور حاصل کیے جا رہے ہیں وجوہات و عوامل کا ایک سلسلہ ایسا چلا آ رہا ہے کہ جو جبر کے عقیدہ کو پھیلانے اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کرنے میں ہمیشہ موثر رہے ہیں۔ منجملہ:

الف۔ سیاسی وجوہات:

بہت سے جابر اور خود سر سیاستدان مستضعفین کے انقلابی جذبہ کو دبانے اور اپنی غیر قانونی حکومت کو بچائے رکھنے کے لیے ہمیشہ یہ نظریہ دیتے

رہے ہیں کہ ہم اپنی طرف سے کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ مقدر اور تاریخی جبر ہماری تقدیر کو بنانے اور سنوارنے کے لیے مؤثر ہے۔ اگر ایک طبقہ امیر اور دوسرا غریب ہے تو یہ سب کچھ قضا و قدر اور یا تاریخی جبر کا کیا دھرا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر کسی حد تک انسانی افکار کو فریب دینے میں مؤثر ہے اور استعماری سیاست کو جاری رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ عقلی اور شرعی لحاظ سے ہماری تقدیر ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔

اور "جبر" کے معنی میں "قضا و قدر" کا کوئی وجود نہیں۔

خدائی قضا و قدر ہماری اپنی حرکت، ارادے و اختیار، ایمان اور تلاش و کوشش کے مطابق مقرر کی گئی ہے۔

ب: نفسیاتی اسباب:

بعض لوگ سست، بے کار اور کاہل ہوتے ہیں جو عموماً اپنی زندگی میں شکست سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اور وہ کبھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہوتے کہ ان کی سستی یا غلطی ان کی شکست کا سبب ہوتی ہے۔

لہٰذا اپنی پاک دامنی کے لیے "جبر" کا سہارا لیتے ہیں اور اپنا گناہ "تقدیر" پر ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے وہ جھوٹا سکون محسوس کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں:

"تقدیر کے آگے ہمارا کیا بس چل سکتا ہے۔
پہلے ہی دن سے سیاہ بختی ہمارے مقدر میں آئی ہے جسے زمزم اور کوثر کا پانی بھی نہیں دھو سکتا
ہم نے تو اپنی طرف سے کوشش کی ہے، لیکن

افسوس کہ بخت اور قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔"

ج۔ اجتماعی اسباب:

بعض لوگ آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور جو گناہ بھی ان کی حیوانی خواہشات کے ساتھ ہم آہنگ ہو اس کے ارتکاب سے نہیں چوکتے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح قانع کرنا چاہتے ہیں کہ گناہگار نہیں ہیں اور اجتماع و معاشرے میں یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ گناہ کے ارتکاب میں ان کا کوئی قصور نہیں۔

اس مقام پر وہ جبر کے عقیدہ کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی ہوس رانیوں کی یہ کہہ کر تاویل کرتے ہیں کہ:

"گناہ کا ارتکاب ہمارے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔"

حالانکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ حتیٰ کہ خود وہ لوگ بھی جو اس طرح کے مسائل کو بیان کرتے ہیں اس جھوٹے اور غلط عقیدے پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن دنیاوی لذتیں اور بے بنیاد مفادات انھیں حقیقت کا آشکار اور واضح طور پر اعتراف کرنے کی اجازت نہیں دیتے لہٰذا ہمارا فرض بنتا ہے کہ

(ہم معاشرے کو تمام آلودگیوں سے پاک رکھنے کے لیے "جبر" کے نظریہ اور تقدیر کے عقیدہ کے خلاف اقدام کریں جو استعمار اور استثمار کا ایک اہم ذریعہ اور شکست کی غلط تاویل کا وسیلہ اور اجتماع اور معاشرے میں اخلاقی جرائم کا سبب ہے۔)

؟ سوالات

۱ ـــــــ "جبر" اور "اختیار" کے عقیدے میں کیا فرق ہے ؟

۲ ـــــــ "جبریوں" کے عقیدہ کی کیا دلیل ہے ؟

۳ ـــــــ ماحول ، ثقافت اور وراثت کی تاثیر کے بارے میں آپ کا کیا جواب ہے ؟

۴ ـــــــ "سیاسی" "نفسیاتی" اور "اجتماعی" اسباب جو جبر کے عقیدے سے متعلق ہیں ، کیا ہیں ؟

۵ ـــــــ ان "اسباب" کے مقابلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟

ساتواں سبق

"ارادہ" اور "اختیار" کی آزادی پر واضح ترین دلیل

۱۔ انسانی ضمیر

اگرچہ مسلم فلاسفہ اور دانشمندوں نے انسانی ارادے کی آزادی پر بہت سے دلائل پیش کیے ہیں جن کا یہاں پر ذکر طوالت کا باعث ہے۔ لہٰذا ہم ان سب سے روشن اور واضح ترین دلیل کا ذکر کریں گے اور وہ ہے "عام انسانی ضمیر"۔

اور وہ اس طرح کہ ہم دوسری تمام چیزوں کا تو انکار کرسکتے ہیں لیکن ایک حقیقت سے کبھی انکار نہیں کرسکتے جس پر پورا عالم انسانیت متفق ہے خواہ خداپرست ہوں یا مادہ پرست، قدیم زمانے کے لوگ ہوں یا جدید دور کے،

مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے، امیر ہوں یا غریب، ترقی یافتہ ہوں یا پسماندہ۔ خواہ ان کا تعلق معاشرے کے کسی طبقے سے ہو سب کے سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ:

"معاشرے پر قانون کی حکمرانی ضروری ہے"

قانون پر عملدرآمد ہر فرد کا فرض ہے اور وہ اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا ملنی چاہیے۔

غرض قانون کی حکمرانی، قانون کے مقابل افراد کی ذمہ داری اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا، ایسے مسائل ہیں جن پر تمام عقلائے عالم کا اتفاق ہے۔ صرف وحشی قومیں ان مسائل کو تسلیم نہیں کرتی ہیں۔

یہ مسئلہ جسے ہم "کائنات کے انسانی ضمیر" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں انسانی ارادے کی آزادی اور انسان کے صاحبِ اختیار ہونے کی واضح ترین دلیل ہے۔

یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ ایک طرف تو انسان مکمل طور پر اپنے تمام ارادے اور اعمال میں مجبور ہو اور دوسری طرف وہ قانون کے سامنے جوابدہ بھی ہو اور خلاف ورزی کی صورت میں اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس سے پوچھ گچھ کی جائے اور کہا جائے کہ

"تو نے یہ کیوں کیا؟ وہ کیوں نہیں کیا؟"

اور جرم ثابت ہو جانے کی صورت میں اسے سزائے قید یا سزائے موت دی جائے۔

یہ تو بالکل اسی طرح ہوگا کہ ہم ایک ایسے پتھر پر مقدمہ چلائیں اور اس کی سزا تجویز کریں کہ جس کے پہاڑ سے گرنے کی بنا پر راستے سے گزرنے والا مسافر ہلاک ہو گیا ہو۔

یہ درست ہے کہ ایک انسان اور پتھر کے درمیان آپس میں بہت بڑا فرق ہے لیکن جب ہم انسان سے ارادے اور اختیار کی نفی کے عقیدے کو مان لیں تو یہ ظاہری فرق کچھ اہم نہیں ہوگا۔ بلکہ دونوں "جبری اسباب" کے تابع ہوں گے۔

پتھر کششِ ثقل کے جبری قانون کے تحت سڑک پر گرتا ہے اور قاتل اور ڈاکو انسان کچھ اور جبری اسباب کے تحت جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور جبریوں کے عقیدے کے مطابق نتیجہ کے لحاظ سے ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اور چونکہ کسی نے بھی اپنے ارادے اور اختیار سے کوئی کام انجام نہیں دیا تو پھر کیوں ایک پر مقدمہ چلایا جائے اور دوسرے پر نہیں۔

اب ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ یا تو کائنات کے تمام انسانوں کے ضمیر کو جھٹلائیں اور دنیا بھر کی عدالتوں سے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ملنے والی سزاؤں کو عبث اور بے ہودہ بلکہ ظالمانہ قرار دیں اور یا پھر عقیدۂ جبر کا انکار کریں۔

یقیناً ہمیں دوسرے نظریے کو اپنانا پڑے گا۔

اور پھر مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو نظریاتی اور فلسفی نکتۂ نظر سے عقیدۂ جبر پر استدلال کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جب وہ زندگی کے مختلف مراحل میں داخل ہوتے ہیں تو عملی طور پر "آزادیٔ ارادہ" کے علمبردار نظر آتے ہیں۔

کیونکہ جب کوئی ان کے حقوق چھیننا چاہتا ہے یا انھیں کسی قسم کی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے تو وہ فوراً چیخ اٹھتے ہیں، اسے سرزنش

کرتے ہیں، اسے سزا دلانے کے لیے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ جب تک اپنے حریف کو سزا نہ دلوا دیں آرام سے نہیں بیٹھتے۔

اب ہم یہاں پر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جب انسان از خود کوئی اختیار ہی نہیں رکھتا اور وہ بے ارادہ اور بے اختیار ہے تو پھر یہ چیخ و پکار، شکوہ، شکایات اور عدالتوں کے چکر کیسے؟

بہرحال عقلائے عالم کے عمومی ضمیر کا فیصلہ اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے کہ تمام انسان ارادے کی آزادی کو تہہ دل سے مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیشہ اس عقیدے پر قائم ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے اور دنیا کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس عقیدے کے بغیر ایک پل بھی نہیں چل سکتی۔

عظیم اسلامی فیلسوف خواجہ نصیر الدین طوسی نے جبر و اختیار کی بحث میں ایک مختصر لیکن زبردست اہمیت کا حامل جملہ کہا ہے۔

وہ فرماتے ہیں:

"وَالضَّرُورَۃُ قَاضِیَۃٌ بِاسْتِنَادِ اَفْعَالِنَا اِلَیْنَا۔"

"ہمارا ضروری ادراک اور ضمیر اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمارے تمام افعال ہماری اپنی طرف منسوب ہیں۔"[1]

---

[1] کتاب تجرید العقائد۔ بحث جبر و اختیار

۲۔ جبر کا مذہب سے تضاد

جو کچھ اوپر بتایا جا چکا ہے وہ عقلائے جہان کا عمومی نظریہ ہے خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو کار ہیں یا کلی طور پر مذہب کے منکر ہیں۔

لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ہمارے پاس عقیدۂ جبر کے باطل ہونے پر قاطع دلیل موجود ہے۔

کیونکہ مذہبی عقائد جبر کے عقیدے کے ساتھ کبھی بھی میل نہیں کھاتے اور اگر کوئی مذہب اس نظریے کو اپناتا ہے تو دوسرے تمام مذہبی عقائد مخدوش ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ جبر کا نظریہ عدالت کے خلاف ہے۔ تو عدل الٰہی کے بھی یقیناً خلاف ہے۔ کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم کسی کو گناہ کے ارتکاب پر مجبور کرے اور پھر اس ارتکاب کے جرم میں اسے سزا بھی دے۔ تو یہ نظریہ منطقی لحاظ سے کسی معقول انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں۔

بنا بریں اگر "جبر" کا نظریہ اپنا لیا جائے تو ثواب ـــــ عقاب ـــــ جزا ـــــ سزا ـــــ دوزخ ـــــ اور بہشت کے جیسے عقائد بے معنیٰ ہو کر رہ جائیں گے۔

اسی طرح نامۂ اعمال ـــــ سوال و جواب ـــــ اور ـــــ حساب و کتاب ـــــ قرآن مجید میں مذکور بدکاروں کی مذمت ـــــ نیکوکاروں کی مدح و ستائش وغیرہ جیسے مفاہیم کا خاتمہ سمجھا جائے گا ـــــ ! کیونکہ نہ نیک کام کرنے والوں نے از خود کوئی اچھا کام کیا ہے

اور نہ ہی بُرا کام کرنے والوں نے۔

ان سب سے ہٹ کر مذہب کی سب سے پہلی اور بنیادی چیز "فریضہ اور ذمّہ داری" ہے۔ لیکن جو شخص اپنے ارادے اور اختیار سے کوئی کام نہیں کر سکتا اس پر فرض کی ادائیگی کیسی؟

اور ادا کرنے یا نہ کرنے کا کیا سوال؟

آیا جس شخص کا ہاتھ کانپتا ہو اُسے کہا جا سکتا ہے کہ "ایسا مت کرو؟"

یا جو شخص گڑھے میں گر رہا ہو اُسے کہا جا سکتا ہے کہ "رُک جاؤ۔"

اسی بنا پر حضرت امیرالمومنین علی علیہ السّلام نے ایک مشہور و معروف روایت میں جبر کے عقیدے کو بت پرستوں اور شیطانی گروہ کا عقیدہ بنایا ہے۔

فرماتے ہیں:

"تِلْكَ مَقَالَةُ اِخْوَانِ عَبَدَةِ الْاَوْثَانِ وَخُصَمَاءِ الرَّحْمَانِ وَحِزْبِ الشَّيْطَانِ"

"یہ مقولہ (نظریہ) بت پرستوں کے بھائیوں اللہ کے دشمنوں اور شیطان کے ٹولے کا ہے۔" [1]

---

[1] اصول کافی ج اوّل صفحہ ۱۱۹۔ باب الجبر والقدر

سوالات ؟
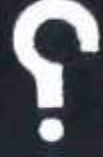
۱. جبر کے بطلان پر واضح ترین دلیل کون سی ہے ؟

۲. عالم انسانیت کا ضمیر آزادئ ارادے کے بارے میں کیا کہتا ہے ؟ تفصیل سے بیان کریں۔

۳. آیا جبری عقیدہ کے پیروکار عملی طور پر بھی جبری ہیں ؟

۴. آیا جبر کا عقیدہ ، عدالتِ خداوندی سے مطابقت رکھتا ہے ؟ اگر نہیں تو کس لیے ؟

۵. ارادے کی آزادی" فریضہ اور ذمہ داری" کی بنیاد کس طرح بنتی ہے ؟

آٹھواں سبق

"امر بین الامرین" کیا ہے؟

۱۔ جبر کے مقابلے میں تفویض

"جبر" کے عقیدے کے مقابلے میں ایک مکتبِ فکر نے ایک اور عقیدے کی بنیاد ڈالی ہے جس کا نام "تفویض" ہے۔ جبکہ دونوں بالترتیب افراط اور تفریط کا شکار ہیں۔

مکتبِ تفویض کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے ہمیں خلق فرما دینے کے بعد سب کچھ ہمارے سپرد کر دیا ہے اور اب بالکل ہمارے افعال اور اعمال سے بے گانہ ہے، اس لحاظ سے ہم اپنے اعمال کی قلمرو میں مستقل اور مطلق العنان حاکم ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا عقیدہ توحید کے عقیدہ سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ توحید کی تعلیم تو یہ ہے کہ:

تمام جہانوں کا مالک خدا ہے۔

اس کی حکومت سے کوئی چیز باہر نہیں، حتیٰ کہ ہمارے اعمال باوجود ہماری خود مختاری اور ارادے کی آزادی کے خدا کی حکومت سے کسی طرح باہر نہیں ہو سکتے وگرنہ اس صورت میں شرک لازم آئے گا۔

واضح طور پر: عرض کریں کہ ہم دو خداؤں کے قائل نہیں ہو سکتے! ایک "بڑا خدا" جس نے ہمیں اور تمام کائنات کو خلق فرمایا۔

اور دوسرا "چھوٹا خدا" یعنی انسان، جو اپنے تمام اعمال اور افعال میں مستقل اور تام الاختیار ہے۔ حتیٰ کہ خداوند عالم کا بھی اس کے اعمال کی قلمرو میں کوئی بس نہیں چل سکتا۔

اس طرح کا عقیدہ شرک اور دوگانہ پرستی ہے۔

صحیح صورت یہ ہوگی کہ ہم انسان کو آزاد اور صاحب اختیار بھی سمجھیں اور خداوند عالم کو اس پر اور اس کے اعمال پر حاکم بھی جانیں۔

۲۔ درمیانی مکتب فکر

یہ تصور نہ کریں کہ مندرجہ بالا صحیح صورتحال میں تضاد پایا جاتا ہے بلکہ یہاں پر ایک نہایت ہی باریک نکتہ مضمر ہے۔

وہ باریک نکتہ یہ ہے کہ:

ہم مکمل طور پر خدا کی "عدالت" کے بھی قائل ہوں اور "بندوں کی آزادی اور جوابدہی" کے بھی معتقد ہوں اور توحید اور تمام کائنات پر اس کی حکومت کو بھی تسلیم کریں۔

یہ وہ عقیدہ ہے جسے ہم "امر بین الامرین" کے

نام سے تعبیر کرتے ہیں ۔ (یعنی ایسا عقیدہ جو دو باطل اور غلط عقائد کے درمیان ایک درمیانی راستہ ہے۔)

چونکہ بحث میں تھوڑی سی پیچیدگی ہے لہٰذا ہم ایک مثال کے ساتھ اس مطلب کو واضح کرنا چاہتے ہیں ۔

فرض کیجیے کہ آپ ایک برقی ریل گاڑی Train کے ذریعے سفر کر رہے ہیں، اور اس کے ڈرائیور بھی خود آپ ہی ہیں ۔

پٹری Railway Line کے اوپر نہایت طاقتور برقی تار لگائے جاتے ہیں اور ایک خاص فیتہ بجلی کے تاروں پر لگا ہوتا ہے جس کے ذریعے ریل کو بجلی فراہم کی جاتی ہے ۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی بجلی کی فراہمی رک جائے تو گاڑی فوراً اسی جگہ پر ٹھہر جائے ۔

اس میں شک نہیں کہ آپ آزاد اور خود مختار ہیں کہ جہاں چاہیں گاڑی ٹھہرا سکتے ہیں ۔ گاڑی کی رفتار کو کم یا زیادہ کر سکتے ہیں جس رفتار میں چاہیں چلا سکتے ہیں، اس کے باوجود کہ گاڑی کا مکمل کنٹرول آپ کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس کا اصل کنٹرول اس کے پاس ہے جو پاور ہاؤس میں بیٹھا ہوا ہے ۔ وہ جب چاہے برقی رو کو بند کر دے اور آپ کی گاڑی وہیں پر رک جائے اور جب چاہے چلا دے ۔

جب ہم اس مثال پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی کا ڈرائیور آزاد اور مکمل خود مختار ہونے کے باوجود کسی دوسری شخصیت کا محتاج ہے جس کے قبضہ میں گاڑی کی اصل طاقت ہے ۔

خداوند عالم نے ہمیں قدرت اور طاقت دی ہے ۔ عقل و ہوش اور جسمانی طاقت سے نوازا ہے اور یہ تمام امکانات اور ذرائع ہر ہر لمحہ ہمیں

خدا کی طرف سے مل رہے ہیں اگر ایک لحظہ بھی اس کی مہربانی اور نوازشیں ہم سے منقطع ہوجائیں تو ہم معدوم اور فنا ہوجائیں۔

اگر ہم کوئی کام انجام دے سکتے ہیں تو یہ اس قدرت کے ساتھ ہیں جو خداوند عالم نے ہمیں عطا فرمائی ہے اور ہر ہر لمحہ ہمیں مل رہی ہے۔ حتیٰ کہ ہماری آزادی اور اختیار بھی اسی کی ذات کے عطاکردہ ہیں۔

یعنی اس نے یہ چاہا ہے کہ ہم آزاد ہو کر قدرت کی اس مہربانی سے فائدہ اٹھائیں اور انسانی کمال کے درجات کی طرف گامزن ہوں۔

بنابریں ہم مکمل اختیار اور آزادی رکھنے کے باوجود اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور ہم نے اس کے مقدس آستانے پر اپنا سر جھکایا ہوا ہے اور اس کی قلمروئے حکومت سے کسی صورت میں بھی باہر نہیں ہو سکتے۔

طاقت اور قدرت رکھنے کے باوجود اس کی قدرتِ کاملہ کے محتاج ہیں۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہیں ہیں اور "الامر بین الامرین" کا یہی معنی ہے۔ کیونکہ اس نظریہ میں نہ تو کسی کو اس کی ذات جیسا تسلیم کیا گیا ہے کہ شرک لازم آجائے۔ اور نہ ہی انسان کو اپنے اعمال میں مجبور مانا گیا ہے کہ "ظلم" لازم آجائے۔

ہمیں یہ درس ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی مقدس درسگاہ سے ملا ہے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ:

"جبر" اور "تفویض" کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ بھی ہے؟

تو فرماتے کہ

"ہے اور ان دونوں سے اس قدر دور جس قدر زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ ہوتا ہے۔"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو اصول کافی جلد اوّل صفحہ ۱۲۱ - باب الجبر والقدر والامر بین الامرین۔

۳۔ قرآن اور "جبر و اختیار"

قرآن مجید میں اس مسئلہ کے بارے میں مکمل صراحت موجود ہے اور وہ واضح الفاظ میں انسانی ارادہ کی آزادی کو بیان کرتا ہے اور اس موضوع پر سینکڑوں آیات پیش کرتا ہے :

الف : تمام وہ آیات جن میں امر و نہی اور فرائض کی بجا آوری کا حکم آیا ہے انسانی ارادے کی آزادی پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ اگر انسان آزاد نہ ہو تو یہ احکام بے فائدہ اور لغو ہوں گے۔

ب : تمام وہ آیات جن میں بدکاروں کی سرزنش اور نیک لوگوں کی تعریف اور توصیف کی گئی ہے انسان کے خود مختار ہونے کی دلیل ہیں کیونکہ "جبر" کی حالت میں کسی کی سرزنش اور یا تعریف اور توصیف بے معنیٰ ہوگی۔

ج : تمام وہ آیات جن میں قیامت کے روز سوال و جواب اور پوچھ گچھ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدالت کی تشکیل اور پھر جزا و سزا اور بہشت و دوزخ کا تذکرہ ہے انسان کے خود مختار ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر جبر کا نظریہ مان لیا جائے تو سوال و جواب، عدالت اور مقدمہ اور ظالموں کو سزا سراسر ظلم ہوگا۔

د : جو آیات "انسان کو اپنے اعمال کا گروی" ہونا بتلاتی ہیں جیسے :

"كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ

رَهِينَۃٌ ''

" ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے " (سورہ مدثر۔ آیت ۳۸)

" كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ "

" ہر فرد اپنے ان اعمال کا گروی ہے جو وہ انجام دے چکا ہے ۔" (سورہ طور۔ آیت ۲۱)

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات انسان کے اختیار کو ثابت کرتی ہیں ۔

۵: " اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا "

(سورۂ دھر۔ آیت ۳)

" ہم نے انسان کو راہ دکھلا دی ہے (اب) خواہ وہ شکر گزاری کرے اور خواہ کفرانِ نعمت ۔"

مندرجہ بالا آیات ہمارے اس مدعا کی روشن دلیل ہیں ۔

البتہ قرآن مجید میں کچھ ایسی تعبیرات واقع ہوئی ہیں جو " امر بین الامرین " پر دلالت کرتی ہیں لیکن بعض بے خبر لوگ انھیں جبر پر محمول کرتے ہیں جیسے :

" وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۔"

(سورہ دھر۔ آیت ۳۰)

" یعنی تم ارادہ نہیں کرتے مگر وہ جو کچھ خدا ارادہ کرتا ہے ۔"

تو ظاہر ہے کہ یہ اور اس طرح کی دوسری آیات انسان سے ارادہ سلب کرنے پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں :
تم تمام اختیارات رکھنے کے باوجود خدا کی قدرت کے قبضے میں ہو جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے ۔

سوالات

١ — "تفویض" سے کیا مراد ہے ؟ اور اس میں کیا عیب چھپا ہوا ہے ؟

٢ — " الامر بین الامرین " کے مکتب فکر کو جو ہم نے ائمہ اہلبیتؑ سے لیا، واضح انداز میں بیان کریں اور مثال بھی پیش کریں؟

٣ — جبر اور اختیار کے بارے میں قرآنی آیات کیا کہتی ہیں ؟

٤ — اگر جبر کا نظریہ صحیح مان لیا جائے تو قیامت وغیرہ کا کیا بنے گا ؟

٥ — آیا "وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنْ يَشَآءَ اللّٰهُ" جیسی آیات جبر پر دلالت کرتی ہیں ؟

نواں سبق

ہدایت اور گمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے!

۱۔ ھدایت اور گمراہی کی قسمیں:

ایک مسافر ہاتھ میں کسی کا پتہ Address لیے آپ کے پاس پہنچتا ہے اور آپ سے منزل مقصود کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

مسافر کو منزل مقصود بتانے کے لیے آپ دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں گے:

ایک تو یہ کہ آپ اس کے ساتھ مل کر منزل مقصود کی طرف چل پڑیں گے۔ اپنی نیکی کو حد کمال تک پہنچانے کے لیے مسافر کو منزل تک پہنچا کر واپس آجائیں گے۔

دوسرے یہ کہ ہاتھ کے اشاروں اور دوسری علامتوں کے ذریعے آپ

صرف اس کی راہنمائی تو کردیں تلاش کرنا اس کا اپنا کام ہوگا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ آپ نے دونوں صورتوں میں منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کی ہدایت کی ہے لیکن یہ دونوں صورتیں آپس میں کچھ فرق رکھتی ہیں۔

پہلی صورت کا نام " ایصال الی المطلوب " یعنی منزل مقصود تک پہنچا دینا اور دوسری صورت کا نام " ارایۂ طریق " یعنی صرف راہ دکھا دینا ہے۔

قرآن مجید اور اسلامی روایات میں ہدایت ان دونوں معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔

دوسری طرف ہدایت کبھی صرف "تشریعی" پہلو کی حامل ہوتی ہے جو احکام اور قوانین کے ذریعے وقوع پذیر ہوتی ہے اور کبھی "تکوینی" پہلو ہوتا ہے جو عالم تخلیق و آفرینش کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔

جیسے " نطفے " کی "ایک مکمل انسان" کی طرف ہدایت۔

قرآن مجید اور اسلامی روایات میں ان دونوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

ہم بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں کہ " ہدایت " اور "ضلالت" (گمراہی) خدا کی طرف سے ہوتی ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ " ارایۂ طریق " خدا کی ذات کی جانب سے ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی نے پیغمبر بھیجے ہیں اور آسمانی کتابیں نازل کی ہیں تاکہ انسان کو صحیح راستہ بتائیں۔

لیکن جبری طور پر " منزل مقصود تک پہنچانا " یقیناً انسان کے ارادے اور اختیار کی آزادی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ البتہ چونکہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے جن اعضاء و جوارح اور قدرت و طاقت کی ضرورت ہوتی ہے،

خدا نے وہ سب ہمارے اختیار میں دے دیے ہیں اور وہی تو ہے جو اس راہ میں اپنی توفیق ہمارے شامل حال کرتا ہے۔

اگر ہدایت کا معنی اس لحاظ سے لیا جائے تو اسے "خدا کی طرف سے ہدایت" مراد لیا جائے گا۔ یعنی اسباب اور مقدمات کی فراہمی اور پھر اسے انسان کے اختیار میں دے دینا۔

۲۔ ایک سوال

اب سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے: خدا جسے چاہے ہدایت کردے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔ مثل اس آیہ کے:

"فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ"

خداوند تعالیٰ جسے چاہے ہدایت کرے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔ وہ ناقابل شکست اور صاحب حکمت ہے۔" (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۴)

بعض لوگ قرآن مجید کی دوسری آیات کو دیکھے بغیر اور آیات کی آپس میں تفسیر کو مدنظر رکھے بغیر اس طرح کی آیات کو دیکھتے ہی فوراً اعتراض شروع کردیتے ہیں اور کہتے ہیں جب خدا ہی کسی کو ہدایت کرتا ہے اور خدا ہی گمراہ، تو پھر ہمارا کیا گناہ ہے؟

لیکن جو اصل نکتہ ہے اس پر وہ توجہ نہیں کرتے اور وہ یہ کہ ہمیشہ قرآنی آیات کے باہمی رابطہ کو مدنظر رکھنا چاہئیے تاکہ ان کے حقیقی مفہوم سے اچھی طرح آگاہ ہوسکیں۔

لہٰذا اس مقام پر ہم چند ایک آیات کو جو ہدایت اور ضلالت پر مبنی ہیں بیان کرتے ہیں تاکہ آپ مندرجہ بالا آیہ کے ساتھ ملا کر اسے پڑھیں اور خود ہی نتیجہ حاصل کریں۔

ا : سورہ ابراہیم آیہ ۲۷ میں ہے :

"وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰالِمِينَ"

خدا ستمگاروں کو گمراہ کرتا ہے۔"

ب: سورہ غافر آیہ ۳۴ میں ہے :

"كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ"

"اسی طرح خداوند عالم ہر فضول خرچی کرنے والے اور وسوسہ کرنے والے کو گمراہ کرتا ہے۔"

ج : سورہ عنکبوت آیہ ۶۹ میں ہے :

"وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا"

" جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انھیں
اپنے روشن راستوں کی طرف راہنمائی اور ہدایت
کرتے ہیں۔"

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا خدا کی مشیت اور ارادہ بے حساب اور غیر محدود نہیں ہے۔ یعنی وہ نہ تو کسی کو بے حساب ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور نہ ہی کسی سے بے حساب ہدایت کی توفیق سلب کرتا ہے۔

جو لوگ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ مشکلات سے جنگ کی طرف جاتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرتے ہیں، خارجی دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ خدا نے انھیں ہدایت کا وعدہ دیا ہے اور یہ اس کی عین عدالت ہے۔

اور جو لوگ "ظلم و ستم" کا ارتکاب کرتے ہیں یا اس کی بنیاد رکھتے ہیں ریو لوگ "اسراف" اور "شک وشبہ" اور دلوں میں "وسوسے" ایجاد کرنے کی جانب قدم بڑھاتے ہیں تو خداوند عالم ان سے ہدایت کی توفیق سلب کر لیتا ہے ان اعمال کی وجہ سے ان کے دل تاریک اور ظلمانی ہو جاتے ہیں۔ سعادت اور خوش بختی تک پہنچنے کی توفیق انھیں نصیب نہیں ہو پاتی۔

اور یہ ہے اصل معنی خدا کے گمراہ کرنے کا جو درحقیقت ہمارے پنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اور یہ بھی عین عدالت ہے۔

۳۔ علمِ ازلی اور گناہ کا ارتکاب

جبر و اختیار کی بحث کے آخر میں ہم ایک نہایت ہی اہم موضوع کو بیان کرنا لازم سمجھتے ہیں۔ جو عموماً جبریوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اور

اسے "خدا کا علمِ ازلی" کا نام دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ :

" آیا خدا اس بات کو جانتا تھا کہ فلاں شخص فلاں وقت میں کسی کو قتل کرے گا یا شراب پیئے گا یا کوئی اور جرم کرے گا، یا نہیں جانتا تھا ؟ !
اگر کہیں کہ نہیں جانتا تھا تو خدا کے علم کا انکار کریں گے اور اگر کہیں کہ جانتا تھا تو لازماً وہ کام انجام پانا چاہیے ورنہ خدا کا علم غلط ثابت ہو گا پس خدا کے علم کو غلط ثابت ہونے سے بچانے کی غرض ہی سے سہی گناہ گار مجبور ہیں کہ گناہ کا ارتکاب کریں اور اطاعت گزار اطاعت کریں ۔ "

جن لوگوں نے اپنے گناہوں کو چھپانے اور غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ بہانہ تراشا ہے درحقیقت وہ ایک نکتے سے غافل ہیں اور وہ یہ کہ :

" خداوند تعالیٰ کو روزِ ازل سے ہی اس بات کا علم ہے کہ ہم اپنے ارادے اور اختیار سے گناہ یا اطاعت کا ارتکاب کریں گے ۔"

یعنی ہمارا ارادہ اور اختیار بھی خدا کے علم میں تھا ۔ لہٰذا اگر ہم گناہ کرنے پر مجبور ہو جائیں تو خدا کا علم (نعوذ باللہ) غلط ثابت ہو گا ۔

ہم اس مطلب کو دو سوالوں کے ذریعے مکمل طور پر مجسّم کرتے ہیں :

فرض کریں کہ ایک معلم کو اچھی طرح علم ہے کہ فلاں سُست لڑکا سال کے آخر میں فیل ہو جائے گا ۔ اور اس کی یہ آگاہی سو فیصدی درست اور کئی سالوں

کے تجربوں کا نتیجہ ہے ۔

تو کیا کل امتحان میں فیل ہونے والا شاگرد اپنے اُستاد کا یہ کہہ کر گریبان پکڑ سکتا ہے کہ :

" آپ کی معلومات اور پیش گوئی نے مجھے فیل ہونے پر مجبور کیا ہے ؟ "

اس سے ذرا اور آگے جائیں ۔

فرض کیجیے کہ ایک گناہوں سے پاک اور معصوم انسان کو ایک خاص دن میں ہونے والے ایک نہایت ہی بھیانک قتل کا علم ہے اور وہ کسی مصلحت کی بنا پر نہ تو اس میں مداخلت کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی اسے ظاہر کرنا چاہتا ہے ۔

تو کیا ایسی صورت میں معصوم کا علم، مجرم کو اس کے جرم کی سزا پانے سے بچا سکتا ہے ؟ کہ چونکہ معصوم کو اس کے ارتکاب جرم کا علم تھا لہٰذا وہ اپنے اس کام میں مجبور ہو گیا تھا ۔

خلاصۂ کلام :

خداوند عالم ہرگز کسی کو کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کرتا ۔

؟ سوالات

۱۔ "ہدایت" کی کتنی قسمیں ہیں، تفصیل سے بیان کریں؟

۲۔ جو آیات "ہدایت" اور "ضلالت" کو خدا کی طرف منسوب کرتی ہیں بیان کریں؟

۳۔ خدا کی ہدایت اور ضلالت کا کیا مطلب ہے؟

۴۔ خداوند عالم کے "علمِ ازلی" سے کیا مراد ہے؟

۵۔ آیا علمِ ازلی ہمیں سزا سے بچا سکے گا؟ اس کی مثال پیش کیجیے؟

دسواں سبق

خدا کی عدالت اور "خلود" کا مسئلہ

قرآن مجید میں گناہگار کفار کے متعلق پوری صراحت کے ساتھ دائمی سزا کا ذکر موجود ہے یا دوسرے لفظوں میں "خلود" کو بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ سورہ توبہ آیہ ۶۸ میں ہے:

"وَعَدَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَالْکُفَّارَ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا۔"

"خداوند عالم نے منافق مردوں اور عورتوں اور کفار کو جہنم کی آگ کا وعدہ دیا ہے جس میں وہ

ہمیشہ رہیں گے ۔"

اسی طرح اسی آیۃ کے ذیل میں مومن مَردوں اور عورتوں کو ہمیشہ کے لیے بہشت کے باغوں کا وعدہ دیا گیا ہے۔

فرماتا ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

" خداوندعالم نے مومن مَردوں اور عورتوں کے ساتھ بہشت کے باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔"

سوال:

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح قابل قبول ہو سکتی ہے کہ ایک انسان اپنی ساری زندگی ہی جو زیادہ سے زیادہ اسّی یا سو سال ہوتی ہے اگر گناہ کا مرتکب ہو تو اسے لاکھوں کروڑوں سال سزا بھگتنی پڑے۔

البتہ یہ مطلب جزا ئے خیر کے سلسلے میں زیادہ اہم نہیں ہے کیونکہ خدا کی رحمت بہت وسیع ہے اور جزا جس قدر زیادہ ہو خدا کے عظیم فضل و رحمت کی نشانی ہے۔ لیکن بُرے اعمال کے بارے میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ محدود گناہوں کی سزا ہمیشہ کا عذاب ہو۔ آیا اس نظریے کو خدا کی عدالت سے ہم آہنگ

کیا جا سکتا ہے؟ آیا "گناہ" اور "سزا" کے درمیان توازن برقرار نہیں کیا جا سکتا؟

جواب:

صحیح راہ حل تک پہنچنے کے لیے ہمیں چند نکات پر خاص توجہ دینی پڑے گی:

الف: قیامت کے دن کی سزا اور جزا، اس دنیا کی سزا، جزا سے کسی طرح مشابہت نہیں رکھتی۔ مثلاً اگر کوئی شخص دنیا میں کسی کے حقوق پر تجاوز کرے یا چوری کا مرتکب ہو تو اسے کچھ مدت کے لیے جیل میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن قیامت کی بہت سی سزائیں انسان کے اپنے اعمال کے نتیجے یا اس کے کیے ہوئے کاموں کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔

اس سے واضح الفاظ میں یہ کہ

گناہ گار افراد اگلے جہان جا کر جن مشکلات اور رنج و غم سے دوچار ہوں گے درحقیقت وہ نتیجہ ہوگا ان اعمال کا جو وہ اس دنیا میں بجا لا چکے ہوں گے چنانچہ اس سلسلے میں قرآن مجید نہایت ہی واضح اور واشگاف الفاظ میں یوں فرماتا ہے:

"فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَ لَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ"

(سورہ یٰس۔ آیہ ۵۴)

"آج (قیامت کے دن) کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا

سوائے تمھارے اپنے اعمال کے تمھیں اور کوئی
سزا نہیں ملے گی ۔"

ایک سادہ سی مثال سے اس حقیقت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

فرض کیجیے ایک شخص منشیات اور شراب کا استعمال شروع کرتا ہے اسے جس قدر بھی سمجھایا جاتا ہے کہ منشیات کا زہریلا مواد تمھارے معدے کو خراب، دل کو مریض اور اعصاب کو تباہ کر دے گا۔ لیکن وہ کسی کی بات کو نہیں مانتا۔ چند ہفتے یا چند مہینے تو اپنی خیالی لذتوں میں مگن رہتا ہے لیکن آہستہ آہستہ معدے، دل اور اعصاب کی خطرناک بیماریوں کا شکار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر بیسیوں سال بلکہ مرتے دم تک ان بیماریوں میں تڑپتا اور رات دن چیخ و پکار کرتا رہتا ہے۔

تو کیا یہاں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ چند ہفتے یا چند ماہ کے ارتکاب جرم کے نتیجے میں اسے کیوں بیسیوں سال سزا مل رہی ہے؟

یہ سنتے ہی ہر شخص فوراً یہی کہہ اٹھے گا کہ

" یہ سب اس کے اپنے اعمال کا کیا دھرا ہے۔ یعنی
اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے یہ بُرے دن دیکھنے نصیب
نہ ہوتے۔"

اس نے ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ حتیٰ کہ اگر اسے عمر نوحؑ بھی مل جائے اور سینکڑوں ہزاروں سال تک زندہ رہے تب بھی ہمیشہ اس عذاب میں مبتلا رہے گا اور یہ ایک ایسی سزا ہے جسے اس نے جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر مول لیا ہے۔

قیامت کے دن کی اکثر سزائیں بھی اسی قبیل کی ہوں گی۔ اس بنا پر

خدا کی عدالت پر حرف نہیں آسکتا۔

ب : جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ :

"گناہ کی مدت کے مطابق سزا کی مدت ہونی چاہیے"

زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ "گناہ" اور سزا کا باہمی رابطہ "مدت" کے پیمانے پر نہیں بلکہ گناہ کی "کیفیت" اور اس کے "نتیجے" کے پیمانے پر جانچا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو ایک لمحے میں موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے تو بعض موجودہ دنیاوی قوانین کے مطابق بھی اسے عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔

حالانکہ گناہ کی مدت ایک مختصر سا لمحہ ہے اور اس کی سزا بیسیوں سال۔ پھر بھی اس سزا کو کوئی "ظالمانہ اقدام" سے تعبیر نہیں کرتا۔ کیونکہ یہاں پر منٹ، سیکنڈ یا ماہ او رسال کا سوال نہیں۔ بلکہ گناہ کی نوعیت اور اس کے نتیجے کو دیکھا گیا ہے۔

ج : "دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی سزا" کے مستحق صرف وہی لوگ قرار پائیں گے جو اپنے لیے نجات کے تمام دروازے بند کر چکے ہوں گے۔ اور جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر تباہیوں، بربادیوں، کفر اور نفاق میں غرق ہو چکے ہوں گے۔ گویا گناہوں کی تاریکی ان کے تمام وجود کو گھیر چکی ہو گی اور وہ گناہ و کفر کے رنگ میں رنگ چکے ہوں گے۔

اس موقع پر قرآن مجید نے ایک بہترین تعبیر پیش کی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۸۱ میں ہے :

" بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ

اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ "

" جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کریں گے اور گناہ کے آثار ان کے تمام وجود کو گھیر چکے ہوں گے ایسے ہی لوگ جہنمی ہوں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے۔"

ایسے لوگ اپنا رابطہ خدا کی ذات سے مکمل طور پر منقطع کر کے نجات اور سعادت کے تمام دروازے اپنے اوپر بند کر چکے ہیں۔

مندرجہ بالا تینوں نکات کو مدنظر رکھنے کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ کا عذاب جو منافقوں اور کافروں کے ایک خاص گروہ کے لیے مقرر کیا گیا ہے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خدا کی عدالت کے منافی ہو بلکہ یہ خود ان کی اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے جس سے خدا کے پیغمبروں نے پہلے ہی سے آگاہ کر دیا تھا۔

اگر ایسے لوگ اس قسم کی سزاؤں سے بے خبر ہوں اور انبیاء کی دعوت کا پیغام بھی ان تک نہ پہنچ سکا ہو اور نادانی کی بنا پر گناہوں کے مرتکب ہو چکے ہوں تو یقیناً ایسی سخت سزا سے بچ جائیں گے۔

اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ آیات اور اسلامی روایات کی رو سے یہ بات ثابت ہے کہ خداوند عالم کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ گناہگاروں

کا ایک بہت بڑا گروہ مختلف ذرائع سے خدا کی رحمت کا مستحق ہوگا ـــــ کچھ تو "شفاعت" کے ذریعے ۔ کچھ لوگ "عفو اور درگزر" کے ذریعے ۔
اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو کبھی کبھار چھوٹے موٹے نیک اعمال انجام دیتے ہیں لیکن خدا اپنی رحمت سے انھیں بہت بڑی جزا دے گا۔
اور کچھ افراد ایسے ہوں گے جو کچھ عرصہ جہنم میں رہ کر اپنے گناہوں کی سزا بھگتیں گے اور پھر خدا کی رحمت ان کے شامل حال ہوگی اور وہ وہاں سے باہر آجائیں گے ۔

صرف ایسا گروہ باقی رہ جائے گا جو حق کے ساتھ از حد دشمنی اور اپنی شدید ہٹ دھرمی کی وجہ اور حد سے بڑھ کر ظلم و ستم اور کفر و نفاق کی بنا پر کفر اور بے ایمانی کی تاریکی میں گھر چکا ہو گا ۔

سوالات ؟

۱ ـــــ کیوں بعض افراد جہنم کے دائمی عذاب کو عدالتِ خداوندی کے خلاف تعبیر کرتے ہیں ؟

۲ ـــــ آیا اگلے جہان کی سزائیں بھی اس دنیا کی سزاؤں کی مانند ہیں ؟ اگر نہیں تو کیوں ؟

۳ — کیا عدالت کا تقاضہ یہی ہے کہ "گناہ اور سزا" کی مدت ایک ہونی چاہیے ؟

۴ — دائمی سزا کن لوگوں کے لیے ہے ؟

۵ — کون لوگ خدا کی معافی کے مستحق قرار پائیں گے ؟

ایسے رسول ہیں

جو

لوگوں کو بشارت و نذارت دینے والے ہیں،

تاکہ

لوگوں کے پاس

خدا کے مقابلے میں کوئی حجّت نہ رہے "

(سورۂ نسا - آیت ۱۶۵)

نبوّت

فہرستِ اسباق

پہلا سبق

انبیاء کی شناخت

ہمیں خدائی رہنماؤں کی کیوں ضرورت ہے

ہمارا علم محدود ہے

ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے پیغمبروں کے مبعوث ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

آیا ہماری عقلیں حقائق کے ادراک کے لیے کافی نہیں ہیں؟ کیا بشر کی علمی ترقی اسرار کے ظاہر اور حقیقتوں کے روشن ہونے میں معاون ثابت نہیں ہوتی؟

اور پھر یہ کہ انبیاء جو کچھ ہمارے لیے لائے ہیں دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ہم انھیں بخوبی سمجھ سکتے ہیں یا نہیں سمجھ سکتے۔

اگر سمجھ سکتے ہیں تو پھر انبیاء کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں سمجھ سکتے تو

یہ تکلیف مَالَا یُطَاق ہوگی جو شرعاً بھی درست نہیں ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی غور طلب ہے کہ آیا یہ کہاں تک صحیح ہے کہ انسان مکمل طور پر خود کو دوسروں کے اختیار میں دے دے اور ان کی باتوں کو بغیر کسی حیل وحجت کے قبول کر لے؟ کیا پیغمبر ہماری طرح انسان نہیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہم کس طرح اپنی ہی طرح کے انسانوں کے تابع ہوجائیں؟

جواباً عرض ہے کہ اگرچند نکات پر توجہ دی جائے توان تمام سوالات کے جواب واضح ہوجائیں گے اور انسانی زندگی کے لیے انبیاء کی ضرورت خود بخود معلوم ہوجائے گی۔

۱۔ انسانی زندگی میں ہونے والی عظیم علمی پیشرفت کے باوجود ہمیں یہ بات قبول کرنا ہوگی کہ اب بھی ہم جو کچھ جانتے ہیں ان چیزوں کے مقابلہ میں جو ہم نہیں جانتے ایسے ہی ہیں جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ یا رائی کے مقابل پہاڑ۔ بلکہ بعض دانشوروں کے قول کے مطابق، اس وقت علمی لحاظ سے جو کچھ بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ عالمِ ہستی کی عظیم کتاب کے مقابلے میں ابجد کی حیثیت رکھتا ہے۔

بالفاظ دیگر، جس علاقے کو ہمارے علم و دانش نے روشن کیا ہوا ہے وہ ایک بالکل ہی چھوٹا سا محدود علاقہ ہے جس کے دوسری طرف سے ہم مکمل طور پر بے خبر ہیں۔

انبیاء اس لیے آتے ہیں کہ اس وسیع وعریض علاقے کو وہاں تک کہ جہاں تک ہمیں ضرورت ہے روشن کریں۔

درحقیقت ہمارا علم ایک طاقت ور بلب کی مانند ہے جب کہ

انبیاء اور وحیٔ آسمانی آفتاب عالم تاب کی طرح۔ جب صورتحال یہ ہو تو کوئی ایسا عقلمند انسان ہے جو یہ کہے کہ طاقت ور بلب کے ہوتے ہوئے مجھے آفتاب عالم تاب کی کیا ضرورت ؟

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہیں کہ مسائلِ زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

① ــــــ معقول

② ــــــ نامعقول

③ ــــــ مجہول

انبیاء کبھی بھی نامعقول یعنی انسانی عقل و خرد کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے۔ اگر کریں تو وہ پیغمبر نہیں۔ بلکہ انبیاء "مجہولات" کے فہم و ادراک میں ہماری مدد کرتے ہیں اور یہی چیز ہمارے لیے زبردست اہمیت کی حامل ہے۔

بنابریں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عقل و خرد کے ہوتے ہوئے انبیاء کی کوئی ضرورت نہیں (ہندوستان اور دوسرے علاقوں میں رہنے والے برہمنوں کی مانند افراد) یا ایسے لوگ جو کہتے ہیں کہ انسان کی اس علمی ترقی کے دور میں انبیاء اور ان کی تعلیمات کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں نے نہ تو انسانی علم و دانش کی قلمرو کو پہچانا ہے اور نہ ہی یہ لوگ انبیاء کی رسالت کا صحیح علم رکھتے ہیں۔

ان کا یہ دعویٰ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے اوّل جماعت کا کوئی بچہ کہ جو ابھی صرف حروفِ تہجی سے واقف ہوا ہو یہ کہے کہ مجھے کسی استاد و معلم کی ضرورت نہیں کیونکہ میں تمام عالم کا علم رکھتا ہوں۔

کیا اس کی یہ بات معقول ہے ۔؟

پھر یہ کہ انبیاء صرف "معلم انسانیت" ہی تو نہیں بلکہ وہ تو رہبر و راہنما عالم ہیں۔

(انبیاء کی رہبریت سے متعلق بحث آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔)

۲۔ کوئی نہیں کہتا کہ انسان خود کو اپنے جیسے دوسرے انسان کے مکمل اختیار میں دے دے۔

قابل غور نکتہ تو یہی ہے۔

ہم دلائل سے ثابت کریں گے کہ انبیاء کا براہ راست تعلق وحی سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ خدا کے بے انتہا علم سے ارتباط رکھتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم قطعی دلائل سے ان کے، خدا کے ساتھ تعلق کو پہچانیں اور یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم ان آسمانی پیشواؤں کی بات کو سنیں اور ان کی اعلیٰ تعلیمات کو جان و دل سے قبول کریں۔

اگر ہم کسی ماہر طبیب کے نسخہ پر عمل کریں تو کیا یہ خلافِ عقلِ انسانی ہے؟

انبیاء بھی تو روحانی طبیب ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر میں کسی استاد و معلم کے سبق کو جو میری عقل و خرد سے ہم آہنگ بھی ہے قبول کرتا ہوں تو کیا یہ خلافِ عقلِ انسانی ہے؟

انبیاء بھی تو عظیم معلمِ بشریت ہیں۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ضرورتِ بعثتِ انبیاء پر مزید کھل کر بحث کی جائے۔

۱۔ تعلیمی لحاظ سے ضرورت

اگر ہم ایک ایسی خیالی سواری پر سوار ہوں جو نور کی شعاعوں سے بنائی گئی ہو اور جو تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے لامحدود فضا میں پرواز کر سکے تو اس فضا کے صرف ایک گوشے کے نظارے کے لیے ہزاروں عمرِ نوحؑ درکار ہوں گی۔

یہ دنیا اپنی اس وسعت کے ساتھ جس کا مکمل علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے بے فائدہ پیدا نہیں کی گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے تذکرہ کر چکے کہ اس جہان کی پیدائش کا فائدہ خدا کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ وہ ہر نظر سے کامل اور بے نیاز ہے اس میں کسی قسم کا نقص یا کمی نہیں ہے کہ وہ جہان کو پیدا کر کے اس کمی کو پورا کرنا چاہے۔

بنا بریں اس آفرینش سے اس کا مقصد دوسروں پر جود و کرم اور موجوداتِ عالم کو درجۂ کمال تک پہنچانا ہے۔ جس طرح سورج زمین پر چمکتا ہے اس کو ہماری ضرورت نہیں بلکہ ہم ہیں جو اس کی تابندگی کے محتاج ہیں اور اس کی تابندگی سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آیا تنہا ہماری معلومات راہِ تکامل کے طے کرتے اور ایک انسانِ کامل کے مرحلہ تک پہنچنے کے لیے ہر لحاظ سے کافی ہیں؟

ہم اسرارِ کائنات سے کس حد تک واقف ہیں؟

حقیقتِ زندگی کیا ہے؟

یہ دنیا کب سے معرضِ وجود میں آئی۔ اس کا صحیح جواب کوئی نہیں جانتا

کب تک باقی رہے گی۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

اجتماعی اور اقتصادی زندگی کے بارے میں مختلف دانشورانِ عالم مختلف آرار رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ معاشرے کے لیے "سرمایہ داری" کو اچھا سمجھتا ہے۔ دوسرا سوشلزم اور کمیونزم کو معاشرتی واقتصادی زندگی کے لیے مفید خیال کرتا ہے۔ جبکہ تیسرا گروہ دونوں ہی کا مخالف ہے اور دونوں نظاموں کو معاشرے کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں سمجھتا ہے۔

دوسرے شعبہ ہائے حیات میں بھی اسی طرح کے اختلافات وجود رکھتے ہیں۔ ان اختلافات کے درمیان آج کا انسان حیران وسرگرداں ہے کہ کس کو درست مانے، کس کو لغو۔

یہاں پہنچ کر از روئے انصاف یہ ماننا پڑے گا کہ پیدائش کے اصل مقصد (زندگی کے تمام شعبوں میں کمال اور ترقی) تک پہنچنے کے لیے ایسی تعلیمات کی ضرورت ہے جو ہر قسم کی لغویات سے پاک ومنزّہ ہوں اور جو اس طویل راہِ زندگی میں منزلِ مقصود تک پہنچنے میں معاون و مددگار ہوں۔ اور ان تعلیمات کا مبدار ومنبار صرف "علم الٰہی" یعنی وحیٔ آسمانی ہی ہوسکتی ہے۔ جس کے حامل انبیار الٰہی ہیں۔ نیز جس خدا نے ہمیں اس راہِ تکامل کو سر کرنے کے لیے خلق کیا ہے۔ وہ کس طرح اس راہ کی ضروریات سے غافل ہوسکتا ہے اور علم ودانش کے سلسلے میں ہمیں اپنے اختیار پر چھوڑ سکتا ہے۔

۲۔ اجتماعی اور اخلاقی میدان میں رہنمائی کی ضرورت

ہم سب اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ انسانی وجود کے اندر عقل اور خرد کے علاوہ کچھ اور قوی طاقتیں بھی کارفرما ہیں جنھیں "غریزہ یا

خواہشاتِ نفسانی" کہتے ہیں۔خود خواہی ، خود پسندی، غیظ وغضب ،شہوت نفسانی اور اسی طرح کے دوسرے غریزے ہمارے وجود میں پائے جاتے ہیں۔

بے شک انسان اگر ان غریزوں کو قابو میں نہ رکھے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ غرائز انسانی عقل وخرد پر غالب آجائیں۔اور پھر تاریخ میں ایک اور ظالم، جفا کار، ستم گر اور انسان نما درندہ کے وجود کا اضافہ ہو جائے۔جو صحرائی بھیڑیوں سے بھی بدتر ہو۔

انسانیت کی اخلاقی تربیت کے لیے ایک مربّی (تربیت کرنے والے) کی ضرورت ہے۔ایک ایسے "اسوہ" اور "نمونہ" کی ضرورت ہے۔جس کی رفتار و گفتار و کردار ہمارے لیے مثال ہو۔جس کی روشنی میں انسان اپنی اخلاقی تربیت کا سامان کر سکے۔

ہمیں ایسے کامل تربیت کنندہ کی ضرورت ہے جو زندگی کے نشیب و فراز میں ہماری راہنمائی و دستگیری کرے۔اپنی رفتار و کردار کے ذریعہ اخلاقی فضائل وکمالات کے اصول ہماری زندگیوں میں داخل کردے۔شجاعت، شہامت انسان دوستی ، مروّت ، عفو ، وفاداری، نیک چلن ، امانت اور پاکدامنی کو ہماری روحوں میں پیدا کرے۔

یہ کام معصوم پیغمبر کے علاوہ اور کون انجام دے سکتا ہے۔

اسی دلیل کی بنا پر یہ بات قطعًا ناممکن ہے کہ خداوند قادر ومہربان ہمیں ایسے پیشوا اور مربّی حضرات کے وجود سے محروم رکھے۔

(بحث جاری ہے)

▪▬▪▬▪▬▪▬▪▬▪

؟ سوالات

۱ — کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ جس قدر ہمارے علم و دانش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری مجہولات، معلومات سے زیادہ ہیں۔ مثال پیش کریں۔؟

۲ — کیا آپ اندھی تقلید اور انبیاء کی اطاعت میں فرق بیان کر سکتے ہیں۔ اپنے جواب کو وضاحت سے بیان کریں؟

۳ — اگر ہم رہبر و راہنما کے بغیر انجانے راستوں پر چل دیں تو کیا خطرات پیش آسکتے ہیں؟

۴ — ہمیں انبیاء کی راہبری کی کس حد تک ضرورت ہے؟

۵ — آیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس سبق میں کون سی ایسی چیز رہ گئی ہے جو اگلے سبق میں بیان ہوگی۔

دوسرا سبق

قانون کی رُو سے انبیاء کی ضرورت

تمام شعبہ ہائے زندگی میں قانون کی ضرورت

گزشتہ سبق میں ذکر ہو چکا ہے کہ انبیاء کی ضرورت دو لحاظ سے ہے ایک تعلیم اور دوسرے تربیت۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اجتماعی قوانین میں انبیاً کا کردار کس حد تک ضروری ہے اور اس کی کس قدر اہمیت ہے۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کے لیے سب سے بڑا امتیاز جو ہر مرحلہ پر اس کی ترقی کا سبب اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس کی "اجتماعی زندگی" ہے۔ اور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر بنی نوع انسان اجتماع کی اس زنجیر میں پروئے ہوئے نہ ہوتے تو یقیناً آج فکر و تمدن کے لحاظ سے ان کی زندگی "پتھر

کے زمانے" کے انسان سے مختلف نہ ہوتی ۔

یہ اجتماعی سعی و کوشش ہے جس نے ثقافت و تمدن کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں اور جس کی وجہ سے نئی نئی ایجادات اور اکتشافات ہو رہے ہیں ۔

مثال کے طور پر اگر چاند کی سطح پر انسان کے پہنچ جانے ہی کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ یہ ایک یا چند سائنسدانوں کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ہزاروں سائنسدانوں کی صدیوں پر محیط کاوشیں کارفرما ہیں ۔

یا اگر عہد حاضر میں کوئی ڈاکٹر کسی مردہ انسان کے زندہ دل کو کسی دوسرے انسان کے ناقص دل کی جگہ پیوند لگانے میں کامیاب ہوا ہے تو یہ عظیم کارنامہ صرف اسی ڈاکٹر کی محنت کا ثمر نہیں بلکہ یہ کام ہزاروں ڈاکٹروں اور طبیبوں کے ان تجربات اور تحقیقات کا ثمر ہے جو انھوں نے ہزارہا سال کے دوران انجام دیں اور جو ان کے شاگردوں کے ذریعہ رفتہ رفتہ اس زمانے میں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں ۔

البتہ اجتماعی زندگی اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ کئی مشکلات بھی رکھتی ہے ۔ اور وہ ہیں انسانی حقوق اور مفادات کا باہمی ٹکراؤ ، ایک دوسرے کے حقوق کا غصب کرنا ، ظلم و تعدی ، حتیٰ کہ جنگ اور خونریزی!!!

اس مقام پر پہنچ کر ہمیں کسی ایسے آئین و قوانین کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے جو اجتماعی زندگی کی ان مشکلات کو حل کر سکیں ۔

یہ قوانین ہماری تین بڑی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں ۔

(۱) —— قانون معاشرے کے لیے انفرادی فرائض اور ہر فرد کے

لیے معاشرے کے فرائض کو روشن کرتا ہے۔ انسانی استعداد کو پروان چڑھاتا ہے اور لوگوں کی انفرادی کوششوں کو یکجا کرتا ہے۔

(۲) ——— قانون افراد کی طرف سے انجام پانے والے کاموں کی نگرانی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

(۳) ——— قانون ظالموں کے مقابلے میں مظلوموں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور ہر قسم کی ناانصافی کا سدباب کرتا ہے نیز بوقت ضرورت مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے سزا تجویز کرتا ہے۔

بہترین قانون ساز کون ہے؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی ہستی ہے جو بنی نوع انسان کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر قانون سازی کی اہلیت کی حامل ہے اور قوانین بھی ایسے کہ جن میں متذکرہ بالا تینوں شرائط کو پیش نظر رکھا جائے۔ یعنی اجتماع کے مقابلہ میں فرد کے اور فرد کے مقابلہ میں اجتماع کے حقوق و فرائض، انجام پانے والے کاموں پر مکمل نگرانی اور تجاوز کاروں کے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی روک تھام کے لیے اقدامات۔

یہاں اس سلسلے میں ایک مثال پیش خدمت ہے:

انسانی معاشرے کو ایک ریل گاڑی تصور کیجیے اور ارکان حکومت کو اس کا ڈرائیور۔ جو گاڑی کو منزلِ مقصود کی طرف لے جانے کا ذمہ دار ہے ریلوے لائن کو قانون سمجھ لیجیے جو معین ھدف کی طرف لے جانے والے راستے

کا کام دیتی ہے۔ ایسا راستہ جو نشیب و فراز اور پیچ و خم سے گزرتا ہو۔
ایک بہترین ریلوے لائن کے لیے درج ذیل صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔

- —— جس زمین پر یہ لائن بچھائی جائے وہ اس قدر ٹھوس اور مضبوط ہو کہ گاڑی کا زیادہ سے زیادہ بوجھ برداشت کر سکے۔
- —— ریلوے لائن کی دونوں پٹریاں باہم متوازن ہوں اور ان کا درمیانی فاصلہ ریل کے پہیوں کے درمیانی فاصلہ سے مطابقت رکھتا ہو۔
- —— جن سرنگوں کے درمیان سے یہ گاڑی گزرے ان کی دیواریں اور چھتیں گاڑی کے حجم کے مطابق ہوں۔
- —— راستے کے نشیب و فراز اس قدر ناموزوں نہ ہوں کہ بریک لگانے اور ان نشیب و فراز کو طے کرنے میں گاڑی کو دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔
- —— اسی طرح لائن کے ارد گرد موجود پہاڑوں کے پتھروں اور مٹی کے تودوں کے گرنے کا امکان نیز سیلاب اور برفانی تودوں کی ممکنہ رکاوٹ اور اسی قسم کے دوسرے امکانات کو مدنظر رکھا گیا ہو۔ تاکہ ہر قسم کے حالات میں گاڑی وہاں سے خیر و عافیت کے ساتھ گزر سکے۔

اس مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم ایک مرتبہ پھر "انسانی اجتماع" کی طرف پلٹتے ہیں۔

انسانیت کے لیے بہترین قانون سازی کا اہم کام انجام دینے والی ہستی کو درج ذیل خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے:

- ـــــ نوعِ انسانی کی بطور کامل شناخت رکھتی ہو اور اس کی خواہشات، جذبات، ضروریات اور مشکلات سے بخوبی آگاہ ہو۔
- ـــــ قانون سازی کے موقع پر انسان میں موجود قابلیت اور لیاقت اس کے پیش نظر ہو تاکہ انسانی استعداد کو پروان چڑھنے کا موقع مل سکے۔
- ـــــ انسانی اجتماع کو پیش آنے والے ہر قسم کے ممکنہ حوادث اور ان کے ردعمل کی پیش بینی کر سکے۔
- ـــــ انسانی اجتماع میں اس کے ذاتی مفادات موجود نہ ہوں کہ قانون سازی کے وقت اپنے ذاتی مفادات یا اپنے سے وابستہ لوگوں کے مفادات اس کے پیش نظر ہوں۔
- ـــــ اس قانون ساز کو انسانی زندگی میں پیش آنے والی آئندہ تمام ممکنہ ترقیوں اور پیش رفت نیز تنزلی اور انحطاط سے آگاہ ہونا چاہیئے۔
- ـــــ اسے ہر قسم کی خطا، لغزش اور بھول چوک سے مبرّا ہونا چاہیئے۔
- ـــــ اس قانون ساز کو اس قدر طاقت ور اور قدرتمند ہونا چاہیئے کہ وہ معاشرے کی کسی بھی طاقتور ترین ہستی سے مرعوب و خائف نہ ہو سکے اور ساتھ ہی وہ نہایت مہربان اور

دل سوز بھی ہو۔

یہ شرائط کس میں پائی جاتی ہیں؟

آیا انسان بہترین قانون ساز ہو سکتا ہے؟

آیا آج تک کوئی شخص انسان کو مکمل طور پر پہچان سکا ہے؟ جبکہ عصر حاضر کے ایک دانشور نے "انسان موجود ناشناختہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے (جس میں اس نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ انسان وہ موجود ہے جسے آج تک کوئی نہیں پہچان سکا)

آیا انسانی خواہشات، جذبات، ضروریات اور مشکلات کو پوری طرح شناخت کر لیا گیا ہے؟

آیا خدا کے سوا کسی اور پر انسان کی تمام جسمانی اور روحانی ضروریات آشکارا ہیں؟

آیا عام انسانوں میں کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے کہ جس کے اپنے ذاتی مفادات نہ ہوں؟

آیا عام آدمیوں میں کسی ایسے شخص کو آپ جانتے ہیں جو ہر قسم کی غلطیوں اور لغزشوں سے محفوظ ہو؟ اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل سے پوری طرح باخبر ہو۔

اس بنا پر خدا کے علاوہ کوئی اور صحیح اور جامع قانون ساز نہیں ہو سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ جس خدا نے انسان کو ترقی اور کمال کی راہوں کو طے کرنے کے لیے خلق کیا ہے وہ ان کی رہنمائی کے لیے ایسے افراد کو بھی مقرر کرے جو لوگوں کی ان راہوں کی طرف رہنمائی

کا فریضہ انجام دیں اور قوانین الٰہی کو لوگوں تک پہنچائیں ۔
یقیناً جب لوگ یہ جان لیں گے کہ قانون، قانونِ الٰہی ہے تو اس پر مکمل اعتماد اور کامل اطمینان کے ساتھ عمل پیرا ہوں گے ۔ بالفاظِ دیگر ان کی قانون سے آگاہی ہی قوانین کو عملی جامہ پہنانے کی ضامن ہوگی ۔

توحید اور نبوّت کا باہمی رابطہ

یہاں یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ خود نظامِ خلقتِ کائنات ہی انبیاء کی بعثت پر روشن اور واضح تر دلیل ہے ۔
اس نکتہ کی توضیح میں عرض ہے کہ :
کائنات کے اس حیرت انگیز نظام کے بارے میں اگر تھوڑے سے غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خداوند کریم نے کسی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق کو بھی اپنے لطف و کرم سے محروم نہیں رکھا اور اس کی کسی ضرورت کو ذرہ برابر بھی نظر انداز نہیں کیا ۔
مثلاً اگر اس نے ہمیں نظارۂ کائنات کے لیے آنکھوں جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے تو ان آنکھوں کی حفاظت و نگہداشت نیز روشنی کو ایک خاص قاعدے کے ساتھ آنکھوں تک پہنچانے کے لیے پلکیں اور ابرو بھی عطا کیے ۔ آنکھوں کے اطراف میں آنسوؤں کے غدود پیدا کیے تاکہ وہ ہمیشہ آنکھوں کو تر رکھیں ۔ کیونکہ آنکھوں کا خشک ہونا ان کے ضائع ہونے کا سبب ہوگا ۔ اور پھر آنکھوں کے گوشوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بنائے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اضافی پانی ناک میں چلا جائے ۔ اگر یہ سوراخ موجود نہ

ہوں تو پانی کے قطرات ہمیشہ ہماری آنکھوں سے جاری رہیں۔ آنکھوں کی پتلیوں کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ روشنی کی کمی بیشی میں خود سکڑتی اور پھیلتی ہیں اس طرح آنکھوں میں ایک مناسب مقدار میں روشنی داخل ہوتی ہے اور یوں آنکھیں نقصان سے محفوظ رہتی ہیں۔ آنکھوں کے ڈھیلوں کے ارد گرد مختلف خلیے بنائے ہیں تاکہ وہ انھیں آسانی کے ساتھ ادھر ادھر گھما سکیں اور مختلف اطراف میں دیکھنے کے لیے انسان کو سر اور بدن کو نہ ہلانا پڑے۔

آیا جو خدا انسان کی اس قدر چھوٹی چھوٹی ضروریات تک کو پورا کرتا ہے ممکن ہے کہ وہ اسے معصوم، قابل اعتماد اور حاملِ وحی راہبر اور راہنما سے محروم رکھے۔

مشہور فلسفی 'بوعلی سینا'، اپنی معروف کتاب "شفا" میں کہتا ہے کہ

> "اپنی نوع کی بقار اور کمالات کے حصول کے لیے انسان کو انبیار کی بعثت کی اس سے زیادہ ضرورت ہے جتنی آنکھ کو پلکوں اور ابروؤں یا پاؤں کے تلوے کو خلا کی۔ بنا بریں یہ بالکل ناممکن بات ہے کہ خدائے مہربان ایک عام ضرورت کو تو پورا کرے لیکن دوسری اہم ضرورت کو نہیں۔"

سوالات

۱۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز کیا ہے؟
۲۔ قانون کے بغیر انسان کیوں زندگی بسر نہیں کر سکتا؟
۳۔ مثال سے واضح کیجیے کہ انسانی زندگی میں قانون کس حد تک موثر ہے؟
۴۔ بہترین قانون ساز میں کن صفات کا پایا جانا ضروری ہے؟
۵۔ کیوں انبیاء کو انسانوں میں سے ہونا چاہیے؟

تیسرا سبق

انبیاء کیوں معصوم ہوتے ہیں؟

گناہ اور غلطیوں سے بچاؤ

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر کو سب سے پہلے لوگوں کے درمیان اپنا اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ اس طرح کہ اس کی باتوں میں کسی قسم کے جھوٹ اور خلاف واقعہ ہونے کا احتمال باقی نہ رہے۔

بصورت دیگر ان کی رہبری اور قیادت متزلزل ہونے کا خطرہ ہے۔

اگر انبیاء معصوم نہ ہوں تو عذر تراش لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ انبیاء سے غلطیوں کے سرزد ہونے کا امکان ہے۔ لہٰذا ان کی اتباع لازم نہیں۔ نیز اس کے نتیجے میں حقیقت طلب لوگوں کے دلوں میں بھی شکوک وشبہات کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ لہٰذا وہ دعوت

کو قبول کرنے کے معاملہ میں تردد یا کم از کم سردمہری کا شکار ہو جائیں گے۔

یہ دلیل جسے "دلیلِ اعتماد" کا نام دیا جا سکتا ہے انبیاء کی عصمت پر اہم ترین دلیلوں میں سے ایک ہے۔

بالفاظِ دیگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی ایسے شخص کی بے چون وچرا اور غیر مشروط اطاعت کا حکم دے جس سے کسی وقت بھی غلطی سرزد ہونے یا ارتکاب گناہ کا ذرہ برابر بھی شائبہ ہو۔ تو کیا ایسی صورت میں لوگ اس کی اطاعت و پیروی کریں گے؟ اگر اطاعت کریں تو گویا غلطی اور گناہ میں بھی اتباع کریں گے اور اگر اطاعت نہ کریں تو انبیاء کی قیادت تزلزل کا شکار ہو گی۔ خصوصاً اس لیے کہ انبیاء کی قیادت دوسری قیادتوں سے بالکل مختلف حیثیت کی حامل ہے کیونکہ لوگ اپنے عقائد و اعمال انبیاء کی ذات سے لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بزرگ مفسرین:

"اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ"

"خدا کی اطاعت کرو اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو" (سورۂ نساء آیت ۵۹)

کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ: مطلقاً اور غیر مشروط اطاعت کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ تمام انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور "اولی الامر" سے مراد امام معصوم ہیں جو پیغمبر کی طرح معصوم ہیں ورنہ کبھی بھی خداوند تعالیٰ غیر مشروط طور پر ان کی اطاعت کا حکم نہ دیتا۔

ایک اور ذریعے سے بھی انبیاء کا ہر قسم کے گناہوں سے مبرّا اور معصوم ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ:

" انبیاء کی ذات میں گناہ کے عوامل ان کی شکست کا سبب ہوتے ہیں "

وضاحت کے لیے عرض ہے کہ :

جب ہم اپنی ذات میں غور و فکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم بعض گناہوں اور بُرے کاموں سے تقریباً محفوظ یا بالفاظِ دیگر "معصوم" ہیں۔

ذیل کی چند مثالوں پر توجہ فرمائیں :

آج تک آپ نے کسی عقلمند کو دیکھا ہے کہ جو آگ کھانے کی فکر میں ہو ؟ یا اس نے کوڑا کرکٹ اور غلاظتوں کے کھانے کے بارے میں سوچا ہو ؟

آیا کسی باشعور انسان کو دیکھا ہے کہ جو مادر زاد برہنہ ہو کر گلیوں اور بازاروں میں نکل کھڑا ہو ؟

یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا ۔ اور اگر کسی وقت کسی ایسے شخص کو دیکھا بھی ہوگا تو یقیناً کہیں گے کہ اس کا دماغی توازن درست نہیں ۔ یا وہ نفسیاتی مریض ہے ۔ ورنہ کسی عاقل انسان کے لیے ان کاموں کا انجام دینا محال ہے ۔

جب ہم اس طرح کے حالات (اوپر بیان شدہ حالات کی مانند) کا تجزیہ اور تحلیل کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کاموں کی برائی اس قدر واضح ہے کہ ایک باشعور انسان کو اس پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی ۔

یہاں ہم اس حقیقت کو ایک جملہ میں یوں بیان کرسکتے ہیں کہ :

" ہر صحیح اور باشعور انسان کچھ خاص قسم کے

ناشائستہ اور قابل نفرت اعمال سے "محفوظ"
یا بالفاظ دیگر ایک طرح کی "عصمت" کا حامل
ہوتا ہے۔"

اس مرحلہ پر ہم اب کچھ اور آگے بڑھتے ہیں۔
انسانی معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ افراد چند بیہودہ اور ناشائستہ اعمال سے "محفوظ" ہیں۔ جبکہ عام لوگ ان اعمال کی انجام دہی سے پرہیز نہیں برتتے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ماہر ڈاکٹر جو جراثیم کی تمام انواع سے بخوبی آگاہ ہے ہرگز میلا اور گدلا پانی پینے پر تیار نہ ہوگا جبکہ ایک ان پڑھ اور بیخبر آدمی بڑے مزے سے اس پانی کو "نوش جان" کرتا ہے۔
لہٰذا اس مختصر سی بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی موضوع سے انسان کی آگاہی جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی وہ ناشائستہ اور قبیح اعمال سے بچنے کی کوشش کرے گا۔

اس قاعدے کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی انسان کے "ایمان و "آگاہی" کی سطح بلند ہو، خدا اور عدل الٰہی پر اس کا ایمان اس طرح پختہ ہو گویا وہ تمام حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے تو وہ ہر قسم کے گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ ہوگا اور تمام ناشائستہ اور قبیح اعمال اس کے لیے ایسے ہی ہوں گے جیسے کسی کا مادر زاد برہنہ ہو کر گلی کوچوں میں گھومنا۔ اور لقمۂ حرام اس کے لیے ایسا ہی ہوگا جیسے آگ کھانا۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انبیاء کرام کا علم، آگاہی اور خدا کی ذات پر بے حد ایمان انھیں معصیت کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے اور گناہوں کو پروان چڑھانے والے اسباب کی شدت بھی ان کے ایمان

اور عقل پر غالب نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ تمام انبیاء معصوم اور ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ ہیں۔

عصمت ایک ممتاز مقام ہے

بعض لوگ جو عصمت کے مفہوم سے ناآشنا اور گناہوں سے محفوظ رکھنے والے عوامل سے بے خبر ہیں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر خداوند عالم کسی کو گناہوں سے بچائے رکھے اور اس کی ذات میں موجود عوامل گناہ کا خاتمہ کردے تو یہ اس ذات کے لیے کون سی فخر کی بات ہے؟ کیونکہ اس طرح اس کا گناہوں سے محفوظ رہنا ایک جبر کی بنا پر ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے، جیسے کہ ہم گزشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں انبیاء کا گناہوں سے محفوظ رہنا ایک اختیاری امر ہے اور جبر اور زبردستی کا اس میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں بلکہ یہ امر ان کے زبردست ایمان، کامل یقین اور بے حد علم و معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ بات ان کے لیے ایک زبردست افتخار کی حامل ہے۔

اگر کوئی ڈاکٹر شدت کے ساتھ بیماری پیدا کرنے والے عوامل سے پرہیز کرتا ہے تو کیا یہ اس کے مجبور ہونے کی دلیل ہے؟ نیز اگر کوئی حفظانِ صحت کے اصولوں پر سختی کے ساتھ کاربند ہو تو کیا یہ اس کی فضیلت شمار نہ ہو گی؟

یا اگر کوئی قانون دان کسی جرم کے خطرناک انجام کے پیش نظر اس سے پرہیز کرتا ہے تو کیا یہ بات قابل تحسین نہیں؟

بنا بریں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انبیاء کی عصمت ایک اختیاری

عمل ہے جوان کے لیے ایک افتخارِ عظیم کا باعث ہے ۔

؟ سوالات

۱۔ معصوم ہونے کی کتنی اقسام ہیں ؟
۲۔ اگر انبیاء معصوم نہ ہوتے تو کیا ہوتا ؟
۳۔ "عصمت" کی کیا حقیقت ہے ؟
۴۔ سبق میں بیان کردہ مثالوں کے علاوہ ایسی مثالیں پیش کریں جن کے مطابق تمام یا کچھ لوگ "معصوم" ہوں ؟
۵۔ انبیاء کی "عصمت" اختیاری ہے یا اجباری ؟ دلیل سے بیان کیجیے ۔

چوتھا سبق

انبیاء کی شناخت کا بہترین طریقہ

بے شک ہر مدعی کے دعوے کو قبول کر لینا برخلافِ عقل و منطق ہے کیونکہ خدا کی طرف سے مبعوث کیے گئے افراد کا دعویٔ نبوت و رسالت تو درست ہے لیکن اس بات کا بھی تو قوی امکان ہے کہ کوئی ابن الوقت اور دھوکے باز شخص دعویٔ نبوت کر بیٹھے۔ اس بنا پر لازم ہے کہ ہمارے پاس انبیاء کی شناخت کے لیے کوئی قطعی معیار ہو جس کے ذریعے ہم ان کے دعویٰ کی سچائی اور خدا سے ان کے تعلق کا یقین حاصل کر سکیں۔

اس مقصد کا حصول کئی راستوں سے ممکن ہے۔ لیکن ہم ذیل میں ان میں سے صرف دو اہم راہوں کا تذکرہ کریں گے۔

۱ —— معجزہ یا ایسے کاموں کی انجام دہی جو انسانی طاقت سے باہر ہوں۔

② —— پیغمبروں کی دعوت کی جزئیات کے ساتھ تحقیق اور قرائن و علامات کی چھان بین ۔

سب سے پہلے ہم "معجزہ" کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں :
کچھ لوگ "معجزہ" کے بارے میں تعجب کا اظہار کرتے ہیں یا اسے افسانوں اور قصے کہانیوں کی صف میں شمار کرتے ہیں ۔ حالانکہ اگر ہم معجزہ کے دقیق اور علمی معنی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان افراد کا یہ تصور بالکل غلط ہے ۔ کیونکہ معجزہ ایک ناممکن اور معلولِ بے علت نہیں بلکہ سادہ لفظوں میں معجزہ خارق العادۃ کام کو کہتے ہیں جس کا ظہور عام آدمی کے بس سے باہر ہے جب تک کہ اس کے پس پردہ ایک مافوق طاقت کارفرما نہ ہو ۔
اس لحاظ سے معجزہ درج ذیل شرائط کا حامل ہوتا ہے :

- —— معجزہ ایک ممکن اور قابل قبول کام ہوتا ہے ۔
- —— عام انسان حتیٰ کہ نابغۂ روزگار افراد بھی اپنی انسانی طاقت کے بل بوتے پر اس کی انجام دہی پر قادر نہیں ہوتے ۔
- —— معجزہ دکھانے والے کو اپنے کام پر اس قدر اطمینان ہو کہ دوسروں کو مقابلہ کی دعوت دے ۔
- —— ہر شخص اس کی انجام دہی پر قادر نہ ہو اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سب لوگ اس کے سامنے عاجز ہوں
- —— معجزہ نبوت یا امامت کے دعویٰ کے ساتھ ہو ۔
(بنا بریں جو خارق العادۃ کام نبی یا امام کے علاوہ دوسروں سے سرزد ہوتے ہیں ۔ وہ معجزہ نہیں بلکہ "کرامت" کہلاتے ہیں ۔)

چند روشن نمونے

ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ مُردوں کو زندہ اور لاعلاج مریضوں کو شفایاب کر دیا کرتے تھے۔

آیا ہمارے پاس کوئی علمی یا عقلی دلیل موجود ہے کہ جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ ایک ایسا انسان جس کے تمام اعضائے بدن کام کرنا چھوڑ دیں اور اس کی موت واقع ہو جائے اس کے بعد وہ دوبارہ حیات تو نہیں پا سکتا؟ یا ہمارے پاس کوئی علمی یا عقلی دلیل ایسی موجود ہے کہ سرطان جواب تک ایک لاعلاج مرض ہے اس کا علاج کبھی بھی دریافت نہیں ہو سکتا؟

البتہ اس میں شک نہیں کہ انسان کے پاس موجودہ حالات میں جو طاقت ہے وہ مُردوں کے زندہ کرنے یا بعض بیماریوں کے علاج سے قاصر ہے۔ ہر چند کہ دنیا بھر کے تمام ڈاکٹر باہم یکجا ہو کر اپنے تجربوں اور معلومات کو کام میں کیوں نہ لائیں۔

لیکن اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ ایک انسان جو خدائی طاقت اور خدا کے بے کراں علم کے ساتھ وابستہ ہے ایک اشارے سے مردے کے بدن میں روح پھونک دے۔ یا لاعلاج مریض کو شفا بخش دے؟

انسانی علم یہ تو کہتا ہے کہ:

"میں نہیں جانتا اور بے بس ہوں لیکن یہ کبھی نہیں کہتا کہ ایسا کام ناممکن یا غیر معقول ہے۔"

ایک اور مثال

موجودہ حالات میں چاند کا سفر خلائی جہاز اور چاند گاڑی کے بغیر انسان کے لیے ناممکن ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کیا مانع ہے کہ انسانی طاقت سے بڑھ کر کوئی طاقت اور انسان کی ایجاد کردہ سواریوں سے بڑھ کر کوئی سواری کسی انسان کے اختیار میں آجائے اور وہ اس کے ذریعے چاند یا اس سے بھی اوپر دیگر آسمانی کروں میں سفر کرے۔

اگر کوئی شخص واقعی صحیح معنوں میں ایسے خارق العادۃ امور انجام دے سکے اور اس کے ساتھ ہی وہ نبوت کا دعویدار بھی ہو اور دوسروں کو مقابلہ کی دعوت یا "چیلنج" کرے اور دوسرے اس کے چیلنج کے مقابل عاجز ہوں تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسا شخص خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ خداوند عالم ایسی طاقت کسی دروغ گو انسان کے اختیار میں دے دے۔ جو دوسرے انسانوں کی گمراہی کا باعث ہو۔

معجزات کو خرافات سے جدا رکھنا چاہیئے

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ حقائق کو مسخ کرنے میں "افراط" اور "تفریط" کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ معجزہ کے سلسلے میں بھی یہی صورتحال ہے۔

بعض نام نہاد دانشور حضرات صریحاً یا اشارتاً معجزے کی حقیقت ہی سے انکار کرتے ہیں جبکہ بعض دوسرے لوگ معمولی معمولی باتوں کو معجزوں میں شمار کرنے لگتے ہیں اور ضعیف روایات اور افسانوی خرافات (جو بعض اوقات دشمن کی طرف سے پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں۔)

کو معجزات کے ساتھ مخلوط کر دیتے ہیں اور انبیاء کے حقیقی معجزات کو خود ساختہ افسانوں اور بے بنیاد اوہام کی گرد میں چھپا دیتے ہیں۔

جب تک کہ حقیقی معجزات کو اس طرح کے جعلی افسانوں سے جدا نہ کیا جائے معجزات کا صحیح چہرہ ہمارے سامنے واضح نہ ہوسکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگ علماء کو ہر دور میں اس بات کا خیال رہا اور انھوں نے ہمیشہ معجزات وغیرہ کے بارے میں صحیح اسلامی روایات و احادیث کو خود ساختہ و جعلی احادیث سے جدا رکھنے کی کوششیں جاری رکھیں اسی بنا پر انھوں نے علم "رجال" کی بنیاد ڈالی تاکہ راویانِ حدیث کو بخوبی پہچانا جاسکے اور اس واسطہ سے "صحیح" اور "ضعیف" احادیث کو جدا کیا جائے اور موہوم مطالب اور حقائق کی آمیزش کو روکا جائے۔

استعمار اور الحادی طاقتیں اس وقت بے کار نہیں بیٹھی ہوئیں بلکہ ان کی پیہم یہ کوشش ہے کہ بے بنیاد اور خود ساختہ افکار کو مقدس دینی عقائد کے ساتھ مخلوط کر دیا جائے۔ اس طرح سے وہ غیر علمی اور غیر منطقی افکار کو عوام میں پھیلا کر انھیں دینِ مقدسِ اسلام سے بدظن کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ دشمن کی اس طرح کی چالوں سے پوری طرح باخبر رہیں۔

معجزہ اور دوسری خارق عادت چیزوں کا فرق

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ "عامل" یا "جوگی" قسم کے لوگ کچھ ایسے کام انجام دیتے ہیں جو حیرت انگیز اور خارق العادۃ ہوتے ہیں۔ ایسے کام افسانہ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان خارق العادت کاموں اور انبیاء کے معجزات میں کیا فرق ہے ؟ اور ہمارے پاس کیا معیار ہے کہ ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرسکیں ؟

اس سوال کے دو روشن ترین جواب ذیل میں دیے گئے ہیں :

۱۔ عامل یا جوگی حضرات ہمیشہ چند محدود کام انجام دیتے ہیں۔ یعنی ان میں کوئی ایسا شخص نہ ملے گا جو آپ کے لیے آپ ہی کی فرمائش کے مطابق کوئی خارق العادت کام انجام دے۔ بلکہ وہ ایسے کام انجام دیتے ہیں جن پر انھوں نے خوب ریاضت کی ہوئی ہوتی ہے اور ان کی انجام دہی پر انھیں پوری پوری قدرت حاصل ہوتی ہے۔

مزید توضیح میں عرض ہے کہ ہر انسان محدود طاقت و قدرت کا حامل ہوتا ہے اور ایک یا چند کاموں میں مہارتِ تامہ حاصل کرسکتا ہے۔

اس کے برعکس انبیاء کے خارق العادت کاموں کے سلسلے میں کوئی قید و شرط نہیں بلکہ بوقت ضرورت ہر قسم کے معجزات انجام دے سکتے ہیں کیونکہ وہ خدا کی طاقت سے مدد حاصل کرتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ خدا کی طاقت کی کوئی حد و انتہا نہیں جبکہ انسان ایک محدود قدرت و قوت کا حامل ہے۔

۲۔ جو کام ایک عامل یا جوگی انجام دیتا ہے وہ کام اسی قسم کا دوسرا شخص بھی انجام دے سکتا ہے۔ یعنی وہ کام انسانی طاقت سے باہر نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ کوئی عامل یا جوگی دوسروں کو کبھی مقابلہ کی دعوت نہیں دیتا یا بالفاظ دیگر چیلنج نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ یہاں اسی جیسے کئی دوسرے افراد موجود ہیں جو یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔

جبکہ انبیاء کرامؑ نہایت اطمینان کے ساتھ پورے جہان کو چیلنج کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

اگر روئے زمین کے تمام انسان بھی جمع ہو جائیں تو ہمارے جیسا کام انجام نہیں دے سکتے "۔

سحر اور جادو کے بارے میں بھی یہی صورتحال ہے۔ اوپر جو دو فرق بیان کیے گئے ہیں وہ جادو کو بھی معجزہ سے جدا کرتے ہیں۔

سوالات

1. "معجزہ" کو معجزہ کیوں کہتے ہیں ؟
2. آیا قانون "علیت" میں استثنار کا نام معجزہ ہے ؟
3. کتنے طریقوں سے معجزہ کو "جوگیوں" اور "جادوگروں" کے کاموں سے جدا کیا جا سکتا ہے ؟
4. معجزہ کی اصل شرائط کیا ہیں ؟
5. آپ نے اپنی زندگی میں کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو معجزہ سے ملتی جلتی ہو ؟

پانچواں سبق

پیغمبرِ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ

زندۂ جاوید معجزہ

تمام علمار اسلام معتقد ہیں کہ قرآن مجید پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

قرآن مجید کو سب سے بڑا معجزہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا عقلی معجزہ ہے جو لوگوں کی روح اور فکر سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

دوسرے یہ ہمیشہ زندہ رہنے والا معجزہ ہے۔

تیسرے یہ کہ یہ چودہ سو سال سے چیلنج کرتا چلا آرہا ہے کہ :

"اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ کتاب آسمانی خدا کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی مانند دوسری کتاب لے آؤ۔"

مقابلہ کی یہ دعوت یا دوسرے لفظوں میں "چیلنج" قرآن مجید میں چند مقامات پر صراحت کے ساتھ مذکور ہے:

" قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ
عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ
لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا

(اے رسول) تم کہہ دو کہ اگر (ساری دنیا کے) آدمی
اور جن اس بات پر اکٹھے ہوں کہ اس قرآن کا
مثل لے آئیں تو اس کے برابر نہیں لا سکتے اگرچہ
(اس کوشش میں) ایک کا ایک مددگار بھی بنے"

ایک دوسری جگہ قرآن شرائط آسان کرتے ہوئے مقابلہ کی دعوت دیتا ہے:

" اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا
بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ
ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

" کیا یہ لوگ کہتے ہیں اس (پیغمبر) نے اس
قرآن کو اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے تو تم (ان
سے صاف صاف) کہہ دو کہ اگر تم (اپنے دعویٰ
میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) ایسے دس سورے
اپنی طرف سے گھڑ کے لے آؤ اور خدا کے علاوہ

جس کو تمھیں بلاتے بن پڑے مدد کے واسطے
بلا لو "۔ (سورۂ ہود آیت ۱۳)

اس کے بعد خصوصیت کے ساتھ اس بات کا اضافہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

" اس پر اگر وہ تمھاری نہ سنیں تو تم سمجھ لو کہ
یہ (قرآن) صرف خدا کے علم سے نازل کیا گیا
ہے اور یہ کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو کیا
تم اب بھی اسلام لاؤ گے (یا نہیں)
(سورہ ہود آیت ۱۴)

مقابلہ کی شرائط مزید نرم کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا
عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

" اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے
بندے (محمدؐ) پر نازل کیا ہے شک میں پڑے
ہو پس اگر تم سچے ہو تو تم (بھی) ایک ایسی ہی
سورۃ بنا لاؤ اور خدا کے سوا جو تمھارے مددگار
ہوں ان کو (بھی) بلا لو " (سورۂ بقرہ آیت ۲۳)

اس کے بعد والی آیت میں بڑی صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

" پس اگر تم یہ نہیں کر سکتے ہو اور ہرگز نہیں کر سکو گے

تو اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور
پتھر ہوں گے اور جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے"۔

منکرین کے ساتھ پے در پے مقابلہ کا یہ چیلنج اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر کو قرآن کے معجزہ ہونے پر مکمل بھروسہ تھا۔

ہر چند کہ پیغمبر اسلام کے اور بھی کئی معجزات ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں لیکن چونکہ قرآن ایک ایسا زندہ معجزہ ہے جو ہم سب کے سامنے موجود ہے لہٰذا ہماری بحث کا موضوع زیادہ تر قرآن ہی رہے گا۔

چیلنج اور اس کا مقابلہ

یہ بات بڑی قابل غور ہے کہ قرآن نے اپنے مخالفین کو پیہم زور دے دیکر مقابلہ کی دعوت دی ہے یا بالفاظ دیگر انھیں للکار للکار کر میدان میں طلب کیا ہے تاکہ ان کے لیے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

مثلاً ایک جگہ کہتا ہے:

"اگر تم سچ کہتے ہو"

دوسری جگہ فرماتا ہے:

"تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے"

تیسری جگہ فرماتا ہے:

"ساری دنیا سے مدد لے لو"

ایک اور جگہ کہتا ہے:

"اس قرآن جیسا کم از کم ایک سورہ تو لے آؤ"

ایک طرف تو یہ صورت ہے اور دوسری طرف قابل توجہ بات یہ ہے کہ

پیغمبرِ اسلام کا اپنے مخالفین سے مقابلہ کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ اسلام نے فقط ان کے مذہب ہی کو جس کے وہ سختی سے پابند تھے خطرے سے دوچار نہیں کر دیا تھا بلکہ ان کے سیاسی اور اقتصادی مفادات حتیٰ کہ ان کے وجود کو بھی خطرہ لاحق تھا۔

بالفاظ دیگر اسلام کی ترقی و پیش رفت اور لوگوں میں اس کے نفوذ نے ان کی پوری زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ لہٰذا وہ مجبور تھے کہ اپنی تمام قوت وطاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔ وہ پیغمبر اسلام کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے جیسے بھی ہو ایک آدھ سورۃ بنا کر لے آئیں تاکہ وہ دوبارہ پھر کبھی قرآن کو معجزے کی صورت میں پیش نہ کر سکیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا انھوں نے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے عرب کے چوٹی کے فصیح وبلیغ افراد کی مدد حاصل کی۔ لیکن ان کو ہمیشہ اس مقابلہ میں منہ کی کھانی پڑی اور شکست و ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مقابلوں کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

ان میں سے ایک کا تذکرہ ذیل میں درج ہے:

ولید ابن مغیرہ کی داستان

جن لوگوں کو اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی ان میں سے ایک "ولید ابن مغیرہ" بھی تھا۔ جو "بنی مخزوم" سے تعلق رکھتا تھا۔ پورے عرب میں اس کی فراست، حسن تدبیر اور سوجھ بوجھ کی دھوم تھی۔ اس سے درخواست کی گئی کہ وہ قرآن کے خارق العادت اور موثر ہونے کے بارے میں غور و فکر کے بعد اس کا موثر جواب تیار کرے۔

"ولید" پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ
"قرآن مجید کی کچھ آیات تلاوت فرمائیں۔"
حضورؐ نے "سورۂ حم سجدہ" کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔
ان آیات کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور
سیدھا "بنی مخزوم" کی طرف سے تشکیل شدہ محفل میں پہنچا اور کہا:

"قسم بخدا! میں نے محمد سے جو کلام سُنا وہ نا
تو انسانی کلام جیسا ہے اور نہ ہی جن اور پریوں
کا کلام ......"

یہاں تک کہ اس نے کہا:

وَاِنَّ لَـهُ لَحَلَاوَةً وَاِنَّ عَلَيْهِ
لَطَلَاوَةً وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ
وَاِنَّ اَسْفَلَـهُ لَمُغْدِقٌ وَاِنَّهُ يَعْلُوْ
وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ۔

"اس کی باتوں میں خاص شیرینی اور مخصوص زیبائی ہے اس کا
بالائی حصّہ ثمردار درخت کی طرح ہے اور اس کی جڑیں مضبوط
ایک ایسا کلام ہے جو ہر چیز پر غالب ہے اور کسی کو اس پر کبھی
غلبہ حاصل نہیں ہوسکے گا۔"

اس اظہار خیال کے بعد ولید کے متعلق قریش میں یہ بات گشت کرنے
لگی کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فریفتہ ہوگیا ہے۔
یہ خبر سن کر ابوجہل حواس باختہ ہوگیا اور اسی پریشانی کے عالم میں وہ
ولید کے گھر گیا اور قریش کا تمام ماجرا بیان کرنے کے بعد اسے قریش کی مجلس

میں آنے کی دعوت دی۔

ولید ان کی اس مجلس میں شریک ہوا اور کہا :

" کیا تم سمجھتے ہو کہ (نعوذ باللہ) محمدؐ دیوانہ ہوگیا ہے ؟
یا تم نے اس کے اندر جنون کی کوئی علامت دیکھی ہے ؟"

تمام حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا :

" نہیں ۔"

پھر ولید نے کہا :

" کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ جھوٹا ہے ؟
آیا وہ آج تک تمھارے درمیان " صادق "
اور " امین " کے نام سے مشہور نہیں ہے ؟ "

یہاں سرداران قریش میں سے کچھ نے کہا :

" تو پھر ہم اسے کس چیز سے نسبت دیں ؟ "

ولید نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا :

" کہو کہ وہ ساحر ہے ! "

اگرچہ وہ اس ذریعہ سے چاہتے تھے کہ لوگوں کا جو گروہ قرآن کا شیفتہ ہو چکا ہے اسے پیغمبرؐ سے دور کر دیں۔ لیکن ان کی یہ تعبیر (ساحر) خود قرآن کے پرکشش اور حیرت انگیز ہونے کی دلیل ہے۔ انھوں نے قرآن کی اس خصوصیت کو " سحر " اور جادو کا نام دیا۔ حالانکہ اس کا سحر و جادو سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

قریش نے پیغمبر اسلام اور قرآن کریم کے خلاف اپنا پروپیگنڈہ تیز تر کر دیا۔ اور جا بجا شور مچانا شروع کر دیا کہ :

" محمد ایک زبردست جادوگر ہے اور یہ آیات
اس کا جادو ہیں، اس سے دور رہنا اور کبھی
اس کی باتوں کو نہ سننا ..... وغیرہ وغیرہ "

لیکن اس تمام تگ و دو کے باوجود ان کی تمام تدبیریں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ حق و حقیقت کے متلاشی جن کے دل پاک اور نیتیں خالص تھیں دنیا کے گوشہ و کنار سے جوق در جوق کھنچ کھنچ کر آنے لگے جیسے کوئی پیاسا پانی کی طرف کھنچ کر آتا ہے۔

آخر کار شکست خوردہ دشمن کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

آج بھی اسی طرح قرآن مجید تمام کائنات کو مقابلہ کی دعوت دے رہا ہے آج بھی اس کا دعویٰ ہے کہ :

اے دانشمندانِ عالم ! اے فلاسفۂ جہان، اے
ادبار دنیا، اگر تمھیں اس کے صحیح ہونے کے بارے میں
کسی قسم کا شک و شبہ ہے اور اسے خدا کا کلام نہیں
انسان کی ذہنی اختراع سمجھتے ہو تو اس جیسا کلام
لے آؤ ۔ !

یہ بھی سب جانتے ہیں کہ دشمنان اسلام خصوصاً عیسائی مشنری جو اسلام کو ایک انقلابی آئین اور اپنا سخت اور خطرناک دشمن سمجھتے ہیں اور ہر سال اسلام کے خلاف اپنے پروپیگنڈے پر لاکھوں اور کروڑوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں اور اسلامی ممالک میں اپنے ثقافتی، سائنسی اور طبی اداروں کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ وہ اتنا سرمایہ خرچ کرنے کی بجائے نزدیک ترین راہ کا انتخاب کرنے اور عرب کے عیسائی دانشمندوں، شاعروں، فلسفیوں اور اہل قلم حضرات

کو ایک جگہ جمع کر کے قرآن جیسا ایک سورہ تیار کر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے لاجواب کر دیتے۔

یقیناً اگر ایسی بات ان کے لیے ممکن ہوتی تو وہ کبھی نہ چوکتے اور ہر قیمت پر اس کام کو انجام دیتے۔ اس معاملہ میں ان کی اس قدر عاجزی و ناتوانی ان کے لیے ایک دندان شکن دلیل اور قرآن کے معجزہ ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سوالات ؟

١- کیوں قرآن مجید پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا معجزہ ہے؟
٢- قرآن مجید کس طرح چیلنج کرتا ہے؟
٣- قرآن کے دشمن اس (قرآن) کو جادو کیوں کہتے ہیں؟
۴- اسلام، دورحاضر میں عیسائیت کا زبردست رقیب کیونکر ہے؟
۵- ولید بن مغیرہ مخزومی کی داستان کیا تھی؟

چھٹا سبق

اعجازِ قرآن کی ایک جھلک

حروفِ مقطّعات کیوں؟

آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے چند سوروں کے اوائل میں الـمٓ، الـمٓر اور "یٰسٓ" جیسے الفاظ آتے ہیں۔ ان حروف کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں۔

بعض اسلامی روایات کے مطابق ان (حروفِ مقطعات) کا ایک رمز و فلسفہ یہ بھی ہے کہ خداوند عالم بتانا چاہتا ہے کہ ایک اتنا عظیم معجزہ قرآن کریم "الف ب" جیسے سادہ الفاظ سے مرکب ہے۔ اور کس طرح ایک عظیم کلام ایسے حروف والفاظ سے بنایا گیا ہے جنھیں چند سال کا بچہ بھی باآسانی پڑھ سکتا ہے۔ حقیقتاً ایک اہم چیز کی اس طرح کے ایک معمولی مواد سے پیدائش

ایک عظیم معجزہ نہیں تو کیا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کس لحاظ سے معجزہ ہے؟

آیا صرف فصاحت و بلاغت یا بالفاظِ دیگر شیریں بیانی، عمدہ تعبیرات اور اپنے حیرت انگیز اثرات کی وجہ سے،

یا اس کا معجزہ ہونا کسی اور لحاظ سے بھی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم جب بھی قرآن پر مختلف زاویوں سے غور کرتے ہیں تو اس کے ہر گوشے اور ہر دریچہ سے معجزات نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں:

- ـــــ فصاحت و بلاغت، الفاظ کی شیرینی، حیرت انگیز جاذبیت اور بے انتہا اثر انگیز۔
- ـــــ اعلیٰ مطالب و مفاہیم کا بیان، خصوصاً عقائد پر گفتگو کا ہر قسم کے خرافات سے پاک ہونا۔
- ـــــ علمی معجزات یعنی ان مسائل سے پردہ اٹھانا جن تک اس وقت کے انسان کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔
- ـــــ بعض مطالب کے بارے میں صحیح اور صریح پیش گوئی۔ (یعنی غیب سے متعلق خبریں)
- ـــــ متضاد مطالب سے پرہیز

مذکورہ پانچ موضوعات کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن وقت اور کتاب کے اختصار کے پیش نظر آئندہ چند اسباق میں چیدہ چیدہ مسائل کو زیر بحث لائیں گے۔

۱۔ فصاحت و بلاغت

ہر پڑھا لکھا انسان اس بات سے واقف ہے کہ ہر کلام کے دو[۲] پہلو ہوتے ہیں :

① ——— الفاظ

② ——— مطالب

جب الفاظ اور کلمات خوبصورت ، شائستہ ، باہم مربوط اور ہر قسم کی پیچیدگیوں سے خالی ہوں اور جملوں کا ایک دوسرے سے ارتباط معنی و مقصود کو درست اور دلنشیں پیرائے میں بیان کرے تو اس کلام کو " فصیح و بلیغ" کہتے ہیں۔

اور قرآن کریم میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں کیونکہ آج تک کسی کی جرأت نہیں ہوسکی کہ وہ اس قسم کی آیات اور سورتیں ، ایسے پرکشش شیریں اور دلنشیں انداز میں پیش کرسکے۔

گزشتہ سبق میں بتایا جا چکا ہے کہ مشرکین عرب کا برگزیدہ نمائندہ " ولید بن مغیرہ " قرآن مجید کی چند آیات سن کر ان کا دلدادہ ہوگیا۔ اور ایک عرصے کے سوچ بچار کے بعد اس نے سرداران قریش کو مشورہ دیا کہ

" اگر قرآن کا مقابلہ کرنا ہے تو اسے " سحر " اور خود پیغمبر[ؐ] کو " ساحر " کہو۔ "

چنانچہ انھوں نے بارہا پیغمبر اسلام[ؐ] پر اس قسم کی تہمتیں لگائیں اگرچہ وہ اس طرح سے آنحضرت[ؐ] کی مذمت کرنا چاہتے تھے لیکن درحقیقت

وہ آپ کی ستائش اور تعریف کر رہے تھے۔

بالفاظِ دیگر

پیغمبرِ اسلامؐ کی حقانیت اور اس کے مقابلہ میں اپنی عاجزی و ناتوانی کا اعتراف کر رہے تھے کیونکہ ان کا قرآن پاک کا مقابلہ کرنے کی بجائے اسے "جادو" اور "جادوگری" کی نسبت دینا قرآن کے خارق العادۃ ہونے کا اعتراف تھا۔

وہ حقیقت کا اعتراف کرنے اور قرآن کو معجزہ ماننے کی بجائے غیر منطقی اور غیر حقیقی راستوں پر چل پڑے اور قرآن کو "جادو" اور "جادوگری" کی نسبت دینے لگے۔

"تاریخِ اسلام میں ایسے بہت سے تند مزاج اور جھگڑالو قسم کے افراد کے تذکرے ملتے ہیں جو پیغمبرِ اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آیاتِ قرآنی سننے کے بعد ان کے اندر تغیّر رونما ہوا اور شمعِ ایمان ان کے دلوں میں منوّر ہوئی۔

ان واقعات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کشش اور فصاحت و بلاغت ایک معجزہ ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں، دورِ حاضر میں بھی جو لوگ عربی زبان و ادب سے واقف ہیں جس قدر قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور بار بار اسے دہراتے ہیں اسی قدر اس سے لذّت حاصل کرتے ہیں اور اس کام سے خستگی و سستی محسوس نہیں کرتے۔

قرآن مجید مشکل سے مشکل مسائل کو ایسے صریح، محکم اور ٹھوس انداز میں پیش کرتا ہے کہ متانت، متانت اور عفّت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

اس نکتہ کا ذکر بھی لازم ہے کہ اس دور میں اہل عرب زبان و ادب میں

ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچے ہوئے تھے۔ اس کا ثبوت دورِ جاہلیت کے وہ اشعار ہیں کہ جن کا شمار آج بھی عربی ادب کے شہ پاروں میں کیا جاتا ہے۔

تاریخوں میں مذکور ہے کہ عرب کے بڑے بڑے ادیب و شاعر ہر سال "بازار عکاظ" میں جمع ہوتے جسے ایک تجارتی اور ادبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اور وہاں اپنے اشعار کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کرتے۔

ان میں سے بہترین اشعار کو "سال کے بہترین اشعار" قرار دیا جاتا اور پھر انھیں لکھ کر دیوار کعبہ پر آویزاں کر دیتے۔

وقت ظہور پیغمبرؐ اس قسم کے سات نمونے موجود تھے جنھیں "سبعہ معلقہ" کہتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے نزول کے بعد فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے وہ قرآن کے مقابلہ میں اس قدر پھیکے پڑ گئے کہ انھیں ایک ایک کر کے اتار دیا گیا۔

مفسرین قرآن نے تاحد امکان مختلف آیات کی باریکیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر کتب تفاسیر کی طرف رجوع کیا جائے تو ان آیات سے آشنائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

حضرت محمدؐ کا ارشاد ہے:

"ظَاهِرُهُ اَنِيقٌ وَبَاطِنُهُ عَمِيقٌ

لَا تُحْصَى عَجَائِبُهُ وَلَا تُبْلَى

غَرَائِبُهُ"

قرآن کا ظاہر نہایت خوبصورت، باطن ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ اس کے عجائبات شمار سے

باہراور یہ کبھی فرسودہ نہیں ہوتا ۔"

امیرالمومنین حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں :

"فِيْهِ رَبِيْعُ الْقَلْبِ وَيَنَابِيْعُ الْعِلْمِ وَمَا لِلْقَلْبِ جَلَاءٌ غَيْرُهُ"

" دلوں کی بہار قرآن میں ہے اور علم و دانش کے چشمے اس سے پھوٹتے ہیں اور انسان کے دل و جان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی صیقل نہیں ۔"

؟ سوالات

۱ — حروفِ مقطعاتِ قرآن کا فلسفہ بیان کیجیے ؟

۲ — آیا قرآن صرف ایک لحاظ سے معجزہ ہے یا کئی لحاظ سے ؟

۳ — کیوں مخالفینِ پیغمبرؐ آپ کو ساحر کہتے تھے ؟

۴ — فصاحت اور بلاغت کے درمیان کیا فرق ہے ؟

۵ — سبعہ معلقہ کا کیا مطلب ہے اور اس کا تعلق کس دور سے ہے ؟

ساتواں سبق

قرآن کا آفاقی پیغام

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن جس خطے میں اُتارا گیا وہاں کا فکری اور ثقافتی ماحول کس نوعیت کا تھا۔

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اس زمانے میں سرزمینِ حجاز کا شمار دنیا کے پسماندہ ترین علاقوں میں ہوتا تھا اور ایسے پسماندہ کہ عصرِ جاہلیت کے لوگوں کو وحشی یا نیم وحشی کا نام دیا جاتا ہے۔

عقیدے کے لحاظ سے وہ بت پرستی کے زبردست عاشق تھے پتھروں اور لکڑی کے بے شمار بُت مختلف صورتوں میں ان کی ثقافت پر اپنا منحوس سایہ ڈالے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ وہ کھجور کے بت بھی بناتے اور ان کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن قحط سالی یا بھوک کی صورت میں انھیں بطور غذا استعمال کر لیتے تھے۔

باوجودیکہ وہ لڑکیوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور انھیں زندہ درگور کردیتے تھے لیکن فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے! اور خدا کو ایک عام انسان کی حد تک تصوّر کرتے تھے۔

ان کے لیے توحید اور یگانہ پرستی سخت تعجب خیز بات تھی۔ جب پیغمبر اسلامؐ نے انھیں خدائے واحد کی عبادت و پرستش کی دعوت دی تو تعجب کے ساتھ کہنے لگے:

"اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ"

"وہ پیغمبر تمام خداؤں کو ایک خدا میں تبدیل کردینا چاہتا ہے۔ یقیناً یہ تو تعجب آور اور حیرت انگیز بات ہے!"

جو شخص ان کی خرافات، جھوٹے افسانوں، کج روی اور غلط افکار کے خلاف بات کرتا، اُسے "دیوانہ" کہتے۔

قبائلی نظام ان پر حاکم تھا۔ قبائل آپس میں اس قدر اختلاف رکھتے تھے کہ اگر ایک دفعہ جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تو برسوں بجھائے نہ بجھ پاتی تھی۔ لوٹ مار قتل اور غارت گری ان کا معمول تھا اور اس پر فخر ان کا شیوہ۔

مکہ میں جو اُن کا اہم ترین مرکز تھا چند ایک پڑھے لکھے انسان ملتے تھے اس کے علاوہ عالم و دانا افراد خال خال ہی پورے عرب میں نظر آتے تھے۔

اس ماحول میں ایک ایسا شخص کہ جس نے نا تو کبھی مکتب و مدرسہ کی شکل دیکھی ہے اور نہ ہی کسی استاد سے سبق سیکھا ہے۔ ایک ایسی کتاب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جو معانی و مطالب کے لحاظ سے اس قدر بھرپور ہے کہ چودہ سو سال

سے علما و دانشمند اس کی تفسیر میں مصروف ہیں اور ہر دور میں نئے نئے حقائق منکشف ہو رہے ہیں۔

عالم ہستی اور اس کے نظام کے بارے میں قرآن مجید نے جو کچھ بتایا ہے بالکل صحیح اور جچا تلا ہے۔

توحید کو مکمل ترین انداز میں پیش کیا ہے۔

خلقت زمین و آسمان ، دن اور رات ، سورج اور چاند ، جمادات اور نباتات اور انسان کی خلقت و آفرینش کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔

کبھی انسانی قلب کی گہرائیوں میں داخل ہو کر "توحید فطری" کی باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے :

" فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ "

" جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو نہایت خلوص سے اس کی عبادت کرنے والے بن کر خدا سے دعا کرتے ہیں اور پھر جب انھیں خدا خشکی پر پہنچا کر نجات دیتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔"

(سورہ عنکبوت آیت ٦٥)

اور کبھی عقلی دلائل کے ساتھ توحید استدلالی کو پیش کرتا ہے۔
"آفاقی" اور" انفسی" دلائل کو بیان کرتا ہے۔
زمین و آسمان کے اسرار و رموز ـــــ حیوانات ـــــ
پہاڑ ـــــ سمندر ـــــ بارش ـــــ نسیم صبح ـــــ اور ـــــ انسانی
جسم و روح کی باریکیوں کو انتہائی لطیف انداز میں بیان کرتا ہے۔
خدا کی صفات کو بیان کرتے وقت عمیق ترین اور دلچسپ ترین
راہ کو اختیار کرتا ہے۔
کبھی کہتا ہے :

"لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ"

"اس جیسا کوئی نہیں۔" (شوریٰ آیت ۱۱)

کبھی فرماتا ہے :

"وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔
وہی بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
جس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں حقیقی بادشاہ
ہر عیب سے بری۔
امن دینے والا، نگہبان، غالب زبردست
بڑائی والا۔
یہ لوگ جس کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں اس سے
پاک ہے۔

وہی خدا خالق ، موجد ، صورتوں کا بنانے والا،
اسی کے اچھے اچھے نام ہیں ۔ جو چیزیں سارے
آسمان اور زمین میں ہیں سب اسی کی تسبیح
کرتی ہیں ۔
اور وہی غالب حکمت والا ہے ۔"

(سورۂ حشر آیات ۲۱ تا ۲۴)

قرآن علم الٰہی کی توصیف اور اس کے لامحدود ہونے کے بارے میں بہترین تعبیر کو کام میں لاتے ہوئے کہتا ہے :

" روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور
سمندر سیاہی بن جائیں اور ان کے ختم ہونے
کے بعد مزید سات سمندر سیاہی بن جائیں اور
خدا کا علم اور اس کی باتیں لکھی جائیں تو بھی
خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی ۔"

(سورۂ لقمان آیت ۲۷)

اس بات کو کہ خداوند عالم ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر جگہ موجود ہے قرآن نہایت ہی بلند تعبیر کے ساتھ بیان کرتا ہے :

" وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ
فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ "

" ساری زمین خدا ہی کی ہے کیا مشرق اور کیا مغرب
پس جہاں کہیں تم رُخ کر لو وہیں خدا کا

سامنا ہے۔" (سورہ بقرہ ۔ آیت ۱۱۵)

"وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ"

"وہ ہر جگہ تمھارے ساتھ ہے اور جو کچھ تم انجام
دیتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

(سورہ حدید آیت ۴)

جب قیامت اور معاد کے بارے میں بحث کرتا ہے تو مشرکین
کے تعجب اور ان کے انکار کے جواب میں کہتا ہے۔ (جب وہ کہتے ہیں کہ کس طرح
خدا ہماری ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا)

"ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی خلقت
بھول گیا اور کہنے لگا کہ بھلا جب یہ ہڈیاں
خاک ہو جائیں گی تو کون زندہ کر سکتا ہے۔
(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ اس کو وہی زندہ کرے گا
جس نے ان کو پہلی مرتبہ زندہ کر دکھایا۔ وہ ہر طرح
کی پیدائش سے واقف ہے جس نے تمھارے
واسطے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی پھر تم اس
سے آگ سلگا لیتے ہو۔ جس نے تمام آسمان اور
زمین پیدا کیے کیا وہ اس پر قابو نہیں رکھتا کہ
ان کے مثل دوبارہ پیدا کر دے ہاں، ضرور

قابو رکھتا ہے اور وہ تو پیدا کرنے والا واقفکار
ہے اسکی شان تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کو پیدا
کرنا چاہتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو ہو جاتی
ہے۔ (سورہ یٰس آیات ۷۸ تا ۸۲)

جس زمانے میں فوٹو گرافی اور ٹیپ ریکارڈر کا نام و نشان بلکہ ذکر تک نہیں تھا۔ اس دور میں قرآن مجید انسانی اعمال کے بارے میں فرماتا ہے :

" یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ○
بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ○ "

" اس روز زمین اپنے تمام حالات بیان کر دے گی
کیونکہ تمھارے پروردگار نے اس کی طرف وحی کی
ہو گی ۔" (سورہ زلزال آیات ۴ تا ۵)

اور کبھی ہاتھ، پاؤں اور بدن کی ہڈیوں کی گواہی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :

" اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ
وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ
اَرْجُلُهُمْ "

" روزِ قیامت ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے
اور ان کے ہاتھ ہم کو بتا دیں گے اور ان کے

پاؤں گواہی دیں گے ۔" (سورہ یٰس آیت ۶۵)

" وَقَالُوا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ "

"اور یہ لوگ اپنے اعضاء بدن سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی تو وہ جواب دیں گے کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اس نے ہم کو بھی اپنی قدرت سے بولنے کی طاقت عطا کی ۔"

(سورہ فصلت آیت ۲۱)

قرآنی معارف اور اس کے مطالب کی عظمت اور اس کے ہر قسم کے خرافات سے پاک و پاکیزہ ہونے کا علم اس وقت ہوگا جب ہم قرآن کریم کا موجودہ (تحریف شدہ) توراۃ اور انجیل کے ساتھ مقابلہ و مقایسہ کریں ۔ اور چند ایک موضوعات کا تقابلی مطالعہ کریں گے ۔

مثلاً دیکھیں گے کہ

توراۃ و انجیل پیدائشِ حضرت آدمؑ کے بارے میں کیا کہتی ہیں ؟ اور قرآن کیا کہتا ہے ؟

داستانِ انبیاء کے سلسلے میں توراۃ کیا کہتی ہے ؟ اور قرآن کیا کہتا ہے ؟

توراۃ اور انجیل خدا کی تعریف و توصیف کس طرح کرتی ہیں ؟

اور قرآن کس طرح تعریف و توصیفِ پروردگار عالم کرتا ہے ؟
اس طرح قرآن اور دیگر کتابوں کا باہمی فرق خود بخود آشکارا ہو جائے گا۔

؟ سوالات

(۱) جس سرزمین سے قرآنی پیغام بلند ہوا وہاں کا ماحول کیسا تھا ؟

(۲) ان لوگوں کے ذہن پر بت پرستی نے کیا اثرات چھوڑے ؟

(۳) "توحید فطری" اور "توحید استدلالی" کے مابین فرق واضح کریں؟

(۴) خدا کی تعریف اور اس کی صفات بیان کرنے میں قرآن کی کیا منطق ہے ؟ چند ایک نمونے بیان کریں۔

(۵) قرآنی موضوعات سے کس طرح بہتر انداز میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ؟

آٹھواں سبق

قرآن اور جدید علمی انکشافات

بے شک قرآن مجید صرف سائنس، طب، نفسیات یا ریاضی کی کتاب نہیں بلکہ قرآن کتاب ہدایت و انسان ساز ہے۔ نیز اس کتاب میں اس راہ کی تمام ضروریات کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

ہمیں صرف اس بات پر ہی تکیہ نہیں کر لینا چاہیے کہ قرآن مختلف علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے بلکہ ہمیں چاہیے کہ اس سے نورِ ایمان، ہدایت، تقویٰ، پرہیزگاری، انسانیت، اخلاق، نظم اور قانون کا درس حاصل کریں۔

البتہ کبھی کبھی قرآن ان عظیم اھداف تک پہنچنے کے لیے سائنس کے کچھ مسائل بیان کرتا ہے اور تخلیقِ کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے اور اس کے دلچسپ امور سے مطلع کرتا ہے۔ خصوصاً توحید کی بحثوں میں تناسب و نظم کے محیر العقول حقائق سے پردہ کشائی کرتا ہے جو اس دور کے دانشوروں کے

وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

قرآن کے اس طرح کے مسائل کے مجموعہ کو ہم "قرآن کے علمی معجزات" کا نام دیتے ہیں۔

ذیل میں ہم قرآن کے چند ایک علمی معجزات کا ذکر کریں گے۔

قرآن اور قانونِ کششِ ثقل

نیوٹن سے پہلے کسی نے کشش ثقل کے قانون کا بطور کامل انکشاف نہیں کیا تھا۔

مشہور ہے کہ نیوٹن ایک دن ایک سیب کے درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر زمین پر گرا۔

بظاہر اس ایک معمولی اور سادہ واقعہ نے نیوٹن کو اس قدر سوچ و بچار پر مجبور کیا کہ وہ سالہا سال تک اس غور و فکر میں مصروف رہا کہ وہ کون سی طاقت ہے جس نے سیب کو زمین کی طرف کھینچا ؟

کیوں سیب آسمان کی طرف نہیں گیا ؟

چنانچہ سالہا سال کی کاوشوں، غور و فکر اور سوچ و بچار کے بعد نیوٹن "قانون "کشش ثقل" دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔

اس قانون کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ نظامِ "منظومہ شمسی" کہاں سے ہے ؟

یہ عظیم کرّے کیوں آفتاب کے گرد اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں ؟

وہ اپنے محور سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کیوں نہیں چلے جاتے ؟

اور اپنے مدار سے جدا ہو کر گرتے کیوں نہیں ؟

یہ کون سی طاقت ہے جو اس بے کراں فضا میں انھیں اپنے مدار کے گرد اتنی باریکی سے گردش دے رہی ہے کہ سوئی کی نوک کے برابر بھی ان میں کبھی فرق ظاہر نہیں ہوا۔

نیوٹن نے اس بات کو دریافت کیا کہ :

" کسی چیز کی حرکت اسے مرکز سے گریز پر آمادہ کرتی ہے لیکن کششِ ثقل اسے مرکز کی طرف جذب کرتی ہے اور جب ان دونوں طاقتوں میں مکمل توازن برقرار ہو جائے۔ یعنی "اجسام" اور "فاصلہ" اس قدر "کشش" ایجاد کریں اور اجسام کی تیز رفتاری مرکز سے گریز پر آمادہ کرے تو "جاذبہ" اور "دافعہ" کا باہمی توازن انھیں ہمیشہ ایک مرکز پر قائم رکھتا ہے۔"

لیکن قرآن کریم چودہ سو سال پہلے اس حقیقت کو سورۂ "رعد" میں کچھ اس طرح بیان کر چکا ہے :

" اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ

بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُوْنَ

"خدا وہی تو ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جن کو تم دیکھتے ہو۔ پھر عرش کے بنانے پر آمادہ ہوا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا کہ ہر ایک وقتِ مقررہ تک چلتا رہے۔ وہی دنیا کے ہر ایک کام کا انتظام کرتا ہے اور اسی غرض سے کہ تم لوگ اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے کا یقین کرلو اپنی آیتیں تفصیل سے بیان کرتا ہے۔"

اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام علی بن موسی الرضاؑ سے ایک حدیث منقول ہے جو آپ نے ایک شخص کے جواب میں ارشاد فرمائی۔

اَلَیْسَ قَالَ اللّٰہ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا؟

قُلْتُ: بَلٰی

قَالَ: ثَمَّ عَمَدٌ لٰکِنْ لَاتَرَوْنَھَا!"

یعنی امام راوی سے فرماتے ہیں کہ کیا خدا نے نہیں فرمایا "نادیدہ ستون"؟

راوی نے کہا: کیوں نہیں!

امام نے فرمایا: پس ستون ہیں لیکن تم دیکھ نہیں پاتے۔"

آیا ادب عربی کے اُفق پر کشش ثقل کی تعبیر کے لیے "نامرئی ستون" سے بڑھ کر کوئی کلمہ ہے جسے عوامی سطح پر پیش کیا جاسکے۔

امیر المومنینؑ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

"هٰذِهِ النُّجُومُ الَّتِيْ فِي السَّمَاءِ مَدَائِنُ مِثْلُ الْمَدَائِنِ الَّتِيْ فِي الْأَرْضِ مَرْبُوْطَةٌ كُلُّ مَدِيْنَةٍ إِلٰى عَمُوْدٍ مِنْ نُوْرٍ"

"یہ ستارے جو آسمان پر ہیں زمین کے شہروں کی مانند ہیں اور ہر شہر دوسرے شہر (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) سے نور کے ستونوں کے ذریعہ مربوط ہے۔"

چنانچہ عصر حاضر کے سائنسدان اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ آسمان کے لاکھوں ستاروں کے درمیان ایسے بے شمار ستارے بھی ہیں جن میں زندہ اور عاقل مخلوقات وجود رکھتی ہیں۔ اگرچہ ابھی ان کے متعلق زیادہ تفصیلات ہم تک نہیں پہنچ پائی ہیں۔

اپنے اور سورج کے گرد زمین کی حرکت

مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس نے اس بات کو دریافت کیا کہ "زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔" ایک اطالوی سائنسدان "گیلیلو" تھا۔

جو آج سے تقریباً چار سو سال قبل گزرا ہے۔

اس دریافت سے قبل دنیا بھر کے علماء اور دانشور "بطلیموس" کے اس نظریہ پر یقین رکھتے تھے کہ :

" تمام دنیا کا محور زمین ہے اور دوسرے تمام کرّے اس کے گرد گھومتے ہیں۔"

البتہ گیلیلو اس دریافت کے جرم میں کلیسا کے عتاب کا شکار ہوا اور اس پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور توبہ اور اظہار ندامت کے بعد اس کی جاں بخشی ہوئی۔ لیکن دوسرے دانشور اس نظریہ پر بدستور قائم رہے اور آج یہ نظریہ سائنس کا ایک اہم موضوع بن گیا ہے۔ حتّٰی کہ کئی تجربات کی روشنی میں گیلیلو کا یہ نظریہ درست مان لیا گیا ہے کہ :

" زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔"

اس کے ساتھ ساتھ فضائی پروازوں کے ذریعے اس نظریہ کو مزید تقویت ملی اور عین الیقین کی حد تک پہنچ گیا۔

خلاصۂ کلام

زمین کی مرکزیت کا نظریہ مسترد کیا جا چکا ہے۔ اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ صرف ہمارے حواس کی غلط تشخیص ہے کہ ہم زمین اور ثوابت و سیارہ کی حرکت میں فرق نہ کر سکے۔

یعنی درحقیقت ہم خود حرکت میں تھے اور ثوابت و سیار کو حرکت میں سمجھتے رہے۔

بہرحال قریباً ڈیڑھ ہزار سال تک بطلیموس کا نظریہ دانشمندوں

کی فکر و ذہن پر چھایا رہا اور نزولِ قرآن تک کوئی اس نظریہ کو مسترد کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔

جب ہم قرآن کریم کی سورۂ نمل آیت ۸۸ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو زمین کا حرکت میں ہونا واضح و آشکار ہو جاتا ہے:

"وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ"

"تم پہاڑوں کو دیکھو گے تو گمان کرو گے کہ ساکت و جامد ہیں حالانکہ وہ بادل کی طرح حرکت کررہے ہیں۔ یہ خداوند عالم کی تخلیق ہے کہ اس نے ہر چیز کو صحیح طریقہ پر بنایا ہے بے شک وہ ان تمام اعمال سے باخبر ہے جو تم انجام دیتے ہو۔"

مذکورہ بالا آیت صراحت کے ساتھ پہاڑوں کی حرکت کا پتہ دیتی ہے۔ حالانکہ ہم انھیں ٹھہرا ہوا خیال کرتے ہیں۔ ان کی حرکت کو بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دینا اس امر کا غماز ہے کہ یہ بادلوں کی طرح سکون اور بغیر شور و غل کے اور غیر محسوس انداز میں حرکت کرتے ہیں۔

اس آیت میں زمین کی حرکت کی بجائے پہاڑوں کی حرکت کا تذکرہ مطلب کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ یہ امر مسلّمہ ہے کہ بغیر زمین کے

حرکت میں آئے ہوئے پہاڑ کا حرکت میں آنا ممکن نہیں۔ بالفاظِ دیگر پہاڑوں کی حرکت عین زمین کی حرکت ہے۔

سوچیے کہ

جس دور میں دنیا بھر کے دانشمند اس بات کے معتقد تھے کہ زمین ساکن ہے اور دوسرے کرّات اس کے گرد حرکت کرتے ہیں اس دور میں قرآن کا صراحت کے ساتھ زمین کے حرکت میں ہونے کی خبر دینا کیا قرآن کا معجزۂ علمی نہیں ؟

اور پھر یہ خبر ایک ایسے شخص کے ذریعہ دینا کہ جو کسی درس گاہ کا فارغ التحصیل نہ تھا بلکہ ایک ایسے ماحول کا رہنے والا تھا کہ جہاں درس وتدریس کا نام ونشان تک نہ تھا اور تہذیب وثقافت اور علم وعمل کے لحاظ سے اس وقت کا پسماندہ ترین علاقہ تھا۔ آیا یہ اس کتاب کی حقانیت کی دلیل نہیں ؟

سوالات

۱۔ قرآن کے علمی معجزات سے کیا مراد ہے ؟

۲۔ کشش ثقل کے قانون کو سب سے پہلے کس زمانے میں اور کس نے دریافت کیا ؟

۳۔ قرآن مجید نے کس آیت میں عمومی کشش کی خبر دی ہے اور کس انداز میں ؟

④ زمین کے "سکون" اور اس کی "حرکت" کے نظریات کن کن لوگوں کی طرف سے پیش کیے گئے اور کتنے عرصہ تک دنیا پر چھائے رہے؟

⑤ قرآن مجید نے کس آیت کے ذریعہ اور کس انداز میں زمین کے متحرک ہونے کی خبر دی ہے؟

نواں سبق

پیغمبرِ اسلامؐ کی حقانیت کی ایک اور دلیل

ہم کسی مدعیٔ نبوت کی حقانیت کا یقین حاصل کرنے اور اس دعویٰ کے سلسلے میں اس کے صدق و کذب کی جانچ کے لیے طلبِ معجزہ کے علاوہ بھی ایک راہ اختیار کریں گے اور یہ راستہ خود مقصد و ہدف تک پہنچنے کی ایک زندہ دلیل ہے۔ اور یہ راہ درج ذیل خصوصیات کی تحقیق و جستجو اور ان کی جمع آوری ہے۔

- ــــــ اخلاقی خصوصیات اور سابقہ زندگی
- ــــــ اظہارِ نبوت کے دوران کے حالات
- ــــــ اعلان نبوت کا زمانہ
- ــــــ نبوت کا منشور
- ــــــ انتظامی پروگرام اور مقصد تک پہنچنے کے ذرائع

- —— ماحول پر دعوت کے اثرات
- —— دعوت دینے والے کا اپنے مقصد کی صداقت پر یقین
- —— مقصد سے انحراف پر اکسانے والی پیشکشوں پر ساز باز نہ کرنا
- —— عمومی اذہان پر تیزی کے ساتھ تاثیر
- —— دعوت قبول کرنے والے کیسے لوگ ہیں

بے شک اگر ہم مذکورہ دس نکات کو ہر مدعیٔ نبوّت کی جانچ کے لیے کسوٹی قرار دیں اور دعویٔ نبوّت کو ان مسائل کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ سچ و جھوٹ کی شناخت نہ ہو سکے۔

مذکورہ بیان کی روشنی میں اب ہم پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا جائزہ لیتے ہیں کہ آپؐ کی دعوت کس حد تک حق پر مبنی تھی۔

گو کہ اس کام کے لیے کئی ضخیم کتب کی ضرورت ہے لیکن ہم کوشش کریں گے کہ نہایت اختصار کے ساتھ اس کو چند صفحات میں بیان کیا جائے۔

- —— پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی خصوصیات اور اعلان نبوت سے پہلے کی زندگی کے بارے میں دوست اور دشمن ہر ایک نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلانِ نبوّتؐ سے قبل بھی آپؐ کی زندگی اس قدر پاک اور پاکیزہ تھی کہ اس عصر جاہلیت میں بھی آپ کو "امین" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ تاریخ کہتی ہے کہ جس وقت آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت علیؑ کو مامور کیا کہ آپؐ کے بعد لوگوں کی امانتیں ان کے سپرد

کر دیں۔

شجاعت واستقامت، حسنِ خلق و وسعت قلب، جوانمردی اور عفوو درگزر آپ کی ایسی صفات ہیں جو صلح اور جنگ ہر دو حالتوں میں آپ کی ذات سے جدا نہ ہوئیں خصوصاً فتح مکہ کے موقع پر جب آپ کے خونخوار دشمن کو شکست و پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اس موقع پر آپ کا عام معافی کا اعلان اس بات کی روشن دلیل ہے۔

سب جانتے ہیں کہ ماحول کا رنگ انسان کے عادات و اطوار اور افکار و کردار پر نہایت نمایاں ہوتا ہے اور اس کلیہ و قاعدہ سے ادنیٰ و اعلیٰ کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، البتہ کسی پر یہ زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور کسی پر کم۔ اب آپ غور کیجیے کہ جو شخص چالیس سال تک جہل و بت پرستی کے ماحول میں پلا بڑھا ہو، ایسا ماحول جس کے عوام کی ثقافت میں شرک اور خرافات رچ بس چکے ہوں، کیسے ممکن ہے کہ وہ اس ماحول میں توحید خالص کا علم بلند کرے اور شرک کی تمام صورتوں کے خلاف اعلان برائت کرے؟ کیسے ممکن ہے کہ جہالت کے ماحول سے اعلیٰ ترین علم کے چشمے پھوٹیں؟

آیا باور کیا جا سکتا ہے کہ تائیدِ الٰہی کے بغیر اس طرح کی حیرت انگیز اور ماورارِ طبیعت چیزیں ظاہر ہوں؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پیغمبرؐ کا ظہور کس دور اور کس زمانے میں ہوا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور اس وقت ہوا جب دنیا "قرون وسطیٰ" کا دور طے کر رہی تھی، ظلم واستبداد کا دور، ظالمانہ نسلی امتیازات کا دور اور طبقاتی نظام کا دور، کیا ہی بہتر ہو کہ اس دور کے حقیقی حالات کو ہم حضرت علیؑ کی زبان سے سنیں جو ظہور اسلام سے قبل اور بعد کے زمانے کو دیکھ چکے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

پیغمبرؐ کو اس وقت میں بھیجا گیا کہ جب لوگ حیرت و پریشانی کے عالم میں گم کردہ راہ تھے اور فتنوں میں ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ نفسانی خواہشات نے انھیں بھٹکا دیا تھا اور غرور نے بہکا دیا تھا اور بھرپور جاہلیت نے ان کی عقلیں کھو دی تھیں اور حالات کے ڈانواڈول ہونے اور جہالت کی بلاؤں کی وجہ سے حیران و پریشان تھے۔

(نہج البلاغۃ خطبہ نمبر ۹۳)

اب آپ غور فرمائیے کہ ایسے بدترین ماحول میں ایک ایسا آئین پیش کیا جائے جس کا نعرہ انسانی مساوات اور طبقاتی و نسلی امتیازات کے خلاف "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کی صورت میں ہو، اس زمانہ کے حالات سے کس قدر سازگار ہو سکتا ہے؟

● آپؐ کی نبوّت کا منشور توحید تھا۔ زندگی کے ہر میدان میں توحید، تمام ظالمانہ امتیازات کا خاتمہ، تمام عالمِ انسانیت کی وحدت، ظلم وستم کا مقابلہ، عالمی حکومت کا قیام، مستضعف اور کمزور عوام کا دفاع اور اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ، پاکی اور امانت بعنوان ارزش انسان کی بہترین کسوٹی۔

● دعوت وتبلیغ کے پروگرام میں آپ نے ہرگز اس بات کی اجازت نہ دی کہ "مقصد وسیلے کو جائز قرار دیتا ہے" کی منطق پر عمل کیا جائے۔ آپؐ مقدس مقصد تک رسائی کے لیے مقدس اور پاکیزہ ذرائع کو کام میں لاتے۔ آپؐ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ

"کسی کے ساتھ دشمنی تمھارے لیے عدل وانصاف کے قیام میں مانع نہ ہو۔" (سورہ مائدہ آیت ۸)

میدانِ جنگ میں بھی آپؐ نے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا سختی کے ساتھ خیال رکھا۔ حکم دیا کہ غیر فوجی افراد سے عدم تعرض برتا جائے۔ درختوں اور نخلستانوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ پینے کے پانی کو آلودہ نہ کیا جائے۔

اور جنگی قیدیوں سے انسانی سلوک روا رکھا جائے۔ یہ چند اور اسی قسم کے سینکڑوں سنہری اصول اس حقیقت کو روشن کرتے ہیں۔

آپ کی دعوت کا ماحول پر اس قدر اثر تھا کہ دشمن، لوگوں کے آپ کے قریب آنے سے بھی ترساں و پریشان رہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ کی ذات اس قدر پرکشش ہے اور آپ کا کلام اتنا پراثر ہے کہ کوئی بھی اس کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایسا بھی ہوتا کہ جب آپ تقریر فرما رہے ہوتے تو دشمن شور مچانا شروع کر دیتے تاکہ لوگ آپ کے کلام کو نہ سن سکیں مبادا ان کے دلوں پر آپ کا کلام اثرانداز ہو جائے اور وہ آپ کے گرویدہ ہو جائیں۔

اسی لیے وہ پیغمبرؐ کے معجزہ نما کلام کو "سحر" سے تعبیر کرتے اور آپ کو "ساحر" کہتے۔ یہ بات خود ضمنی طور پر آنحضرتؐ کی دعوت کے مؤثر ہونے کا اعتراف تھا۔

دعوت کی راہ میں آپ کی قربانیاں اور اس راہ کے مصائب میں صبر و استقلال اس بات کی صراحتاً نشاندہی کرتا ہے کہ آپ اپنی دعوت کی صداقت و حقانیت پر دوسروں سے زیادہ ایمان رکھتے تھے۔

بعض جنگوں میں جبکہ تازہ تازہ وارد اسلام ہونے والے افراد سخت مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور راہ فرار اختیار کر گئے اس موقع پر بھی آپؐ نہایت بہادری سے اپنے مقام پر ڈٹے رہے۔ دشمن نے لالچ اور دھونس و دھمکی غرض ہر ممکن طریقہ سے کوشش کی کہ آپؐ کو آپؐ کے مقصد سے کنارہ کشی پر مجبور کیا جائے لیکن دشمن کی سازشوں کے مقابل لحظہ بھر کے لیے بھی آپؐ کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش پیدا نہ ہو سکی اور آپؐ تندہی کے ساتھ اپنے مقصد کو آگے بڑھانے میں مشغول و مصروف رہے۔

● —— دشمن نے بارہا کوشش کی کہ ساز باز اور سودے بازی کے ذریعہ آپؐ کو آپؐ کے مقصد سے منحرف کر دیا جائے۔ لیکن آپؐ نے کبھی دشمن کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے بلکہ فرمایا:
"اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیا جائے (تمام منظومۂ شمسی میرے اختیار میں دے دیا جائے) پھر بھی میں اپنے مقصد سے باز نہ آؤں گا۔"

● —— آپؐ کی دعوت کے عمومی اذہان پر اس قدر تیز اثرات مرتب ہوئے کہ دنیا اس پر محوِ حیرت ہے۔ جن لوگوں نے مستشرقین کی کتب کا مطالعہ کیا ہے، بخوبی جانتے ہیں

کہ وہ اسلام کی اس تیزی کے ساتھ ترقی اور ایک صدی سے بھی کم عرصے میں اس کے دنیا پر چھا جانے پر کس قدر متحیر ہیں۔ مثال کے طور پر جن تین یورپی مستشرقین نے "تاریخ تمدن عرب و مبانی آنزا در شرق" نامی کتاب لکھی ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

" یہ مسئلہ کہ ایک صدی سے بھی کم مدت میں اسلام کیونکر متمدن دنیا کے ایک وسیع حصے پر سایہ افگن ہو سکا تمام کوششوں کے باوجود ہنوز معمہ بنا ہوا ہے "

واقعتاً یہ ایک معمّہ ہے کہ اس زمانے کے محدود ذرائع کے باوجود اسلام نے کس طرح اس قدر تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے کہ لاکھوں انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں تک جا پہنچا؟ اور متعدد اور متنوع تمدنوں کو اپنے اندر جذب کر کے دنیا کو ایک نئے تمدن سے روشناس کرایا۔

● —— آپؐ کے دشمن کفار کے بڑے بڑے سردار، ظالم متکبرین اور خودغرض سرمایہ دار تھے۔ جب کہ آپؐ کی دعوت کو قبول کرنے والے مومنین کی غالب تعداد پاک دل جوانوں، حق کے طلب گار محروم اور تہی دست افراد حتیٰ کہ غلاموں اور کنیزوں کی تھی جن کے پاس

فقط صدق وصفا اور پاکیزہ قلوب کے سرمایہ کے کچھ نہ تھا اور جو تشنۂ حق تھے۔

اس مختصر سی وضاحت کے ساتھ جس کی تفصیل کے لیے کافی وقت اور ضخیم کتب کی ضرورت ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ کی دعوت اور نبوت خدا کی طرف سے تھی تاکہ انسانیت کو فسق و فجور، تباہی و بربادی، جہل و نادانی، شرک و ظلم اور ناانصافیوں سے نجات دلائی جاسکے۔

سوالات

① آیا کسی پیغمبر کی صداقت جاننے کے لیے معجزہ کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہے؟ مفصل تحریر کیجیے۔

② قرائن سے مراد کون سے قرائن ہیں؟ اور سب سے پہلے کن امور پر غور کیا جاتا ہے؟

③ ظہور اسلام سے پہلے اور بعد کے حالات کا باہمی موازنہ کرنے کے بعد دنیائے عرب کے بارے میں کیا چیز سمجھی جاسکتی ہے؟

④ زمانۂ جاہلیت کے دوران عربوں کی خاص طور پر اور باقی دنیا کی عام طور پر کیا حالت تھی۔ مختصراً بیان کیجیے؟

⑤ دشمنانِ اسلام آنحضرتؐ پر "ساحر" کی تہمت کیوں لگاتے تھے؟

دسواں سبق

ختمِ نبوّت

خاتمیت کا صحیح مفہوم

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے آخری نبیؐ ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ آیا ہے اور نہ آئے گا اور سلسلۂ نبوّت آپؐ پر اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ اور "ضروریاتِ دین" میں سے ہے۔

"ضروریاتِ دین" کے معنی ہیں کہ جس پر تمام مسلمان عقیدہ رکھتے ہیں اور جو دین کے مسلّمات میں سے ہے۔ جیسے تمام لوگ جو کہ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں جانتے ہیں، اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ مسلمان مذہبی لحاظ سے اصولِ "توحید" پر ایمان وایقان رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں

کہ مسلمان آنحضرتؐ کے خاتم النبیین ہونے کے بھی قائل ہیں اور مسلمانوں کا کوئی گروہ بھی کسی نئے پیغمبر کا منتظر نہیں۔

درحقیقت انسانیت کا قافلہ انبیاء کی بعثت کے ساتھ ساتھ اپنے تدریجی کمال کا سفر طے کرتے ہوئے رشد و کمال کے مرحلے تک پہنچ چکا ہے۔ اور یوں کمال تک پہنچنے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ یعنی اپنی مشکلات کو پیغمبرِ اسلامؐ کی جامع تعلیمات کی روشنی میں خود حل کر سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر:

اسلام نوعِ انسانیت کے بلوغ کے دوران کا آخری اور جامع قانون ہے۔ اعتقادات کے لحاظ سے کامل ترین عقائد کا حامل ہے اور عمل کے لحاظ سے اس قدر منظم ہے کہ انسان کی ہر زمانے کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

ختمِ نبوّت کی دلیل

ہم یہاں ختمِ نبوّت کے اثبات میں متعدد دلائل میں سے فقط تین نہایت واضح و روشن دلائل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ یہ مسئلہ بدیہی ہے:

جیسا کہ ہم اس سے قبل گفتگو میں تذکرہ کر چکے ہیں کہ جو شخص بھی روئے زمین پر بسنے والے کسی بھی مسلمان سے ملے گا اور اس کے عقائد کے سلسلہ میں گفتگو کرے گا تو اسے معلوم ہو گا کہ وہ ختمِ نبوت پر مکمل اور غیر متزلزل عقیدہ رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دلیل و برہان کی مدد سے مذہب اسلام کو قبول کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ

کہ وہ عقیدۂ ختمِ نبوت پر ایمان رکھے۔

جیسا کہ ہم گزشتہ اسباق میں دینِ اسلام کی حقانیت کو محکم دلائل سے ثابت کر چکے ہیں اس بنا پر ختمِ نبوت کے عقیدہ کو بھی قبول کرنا چاہیے کیونکہ یہ ضروریاتِ دین میں سے ایک ہے۔

۲۔ اس مسئلہ پر آیاتِ قرآنی:

آیاتِ قرآنی بھی مسئلہ ختمِ نبوّت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جیسے کہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ:

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ
مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَسُوْلَ
اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ"

"محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔" (سورۂ احزاب آیت ۴۰)

یہ آیت اس زمانہ میں نازل ہوئی جب عربوں کے درمیان "متبنّیٰ" یعنی "لے پالک" کا رواج عام تھا۔ وہ لوگ دوسرے کے بچے کو لے کر بالکل اپنی حقیقی اولاد کی طرح رکھتے۔ یعنی وہ ان کا محرم ہوتا اور جائداد کا وارث بھی ٹھہرایا جاتا تھا۔

لیکن اسلام نے جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر دیا اور کہا کہ لے پالک تمھاری حقیقی اولاد کی طرح حقوق نہیں رکھتا۔ اس دور میں لے پالکوں میں سے ایک "زید"

نامی شخص بھی تھا جو پیغمبرِ اسلامؐ کا متبنّیٰ تھا۔ اور آپؐ کا فرزند شمار نہ ہوتا تھا۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ تم بجائے اس کے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کو اس کے باپ کے نام سے یاد کرو انھیں ان کی دو حقیقی صفات "نبوّت" اور "خاتمیت" سے یاد کرو۔

اس تعبیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپؐ کی "خاتمیت" آپؐ کی نبوّت اور رسالت کی مانند سب پر روشن و مسلّم تھی۔

اب صرف ایک سوال ہے جو یہاں باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ
"خاتم" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟"

"خاتم" ۔ "ختم" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ ختم کرنے والا۔ اور وہ چیز جس سے کسی کام کو ختم کیا جائے۔

مثلاً وہ مُہر جو خط کے مکمل ہونے کے بعد آخر میں لگائی جاتی ہے اسے بھی "خاتم" کہتے ہیں۔ اور جیسا کہ انگشتری کو "خاتم" کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ گزشتہ زمانے میں اور اب بھی بعض افراد انگشتری کے نگینے کو نام کی مہر کی جگہ استعمال کرتے ہیں اس نگینے پر اس فرد کا نام یا کوئی مخصوص نشان کندہ ہوتا ہے۔

ہم اسلامی روایات میں پڑھتے ہیں کہ:

جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے زمانے کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو خطوط کے ذریعہ دینِ اسلام کی تبلیغ کریں تو اصحاب نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ سلاطینِ عجم کا یہ دستور ہے کہ مہر کے بغیر

کسی خط کو قبول نہیں کرتے ۔ اس مسئلہ کے پیش نظر آپؐ کے حکم کے مطابق ایک انگشتری تیار کی گئی جس کے نگینے پر "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کندہ تھا ۔ اب آپؐ کے تمام خطوط پر یہ مہر لگائی جانے لگی جبکہ اس سے قبل آپؐ کے خطوط بغیر مہر کے ہوا کرتے تھے ۔

بنا براین "خاتم" کا حقیقی مفہوم اختتام کو پہنچانے والا اور ختم کرنے والا ہے ۔

۳۔ اس مسئلہ پر احادیث و روایاتِ معصومینؑ

اس مسئلہ پر متعدد روایات اور احادیث ہیں سے چند ایک کو ہم یہاں بیان کریں گے ۔

● —— ایک حدیث جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے کہ :

حضرت محمدؐ نے فرمایا :

انبیاء کی صف میں، میں اس طرح ہوں کہ جیسے کسی شخص نے کوئی نہایت خوبصورت گھر بنایا ہو اور اس گھر میں فقط ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے ۔ جو بھی اس گھر کا نظارہ کرتا ہے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ گھر تو نہایت خوبصورت ہے لیکن ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے ۔ میں وہی آخری اینٹ ہوں اور تمام پیغمبروں کا مجھ پر خاتمہ ہو گیا ہے ۔

(تفسیر مجمع البیان)

● ——— حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

"حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اَبَداً اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَحَرَامُہٗ حَرَامٌ اَبَداً اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ"

"حضرت محمدؐ کا حلال کیا ہوا قیامت تک حلال ہے اور آپ کا حرام کیا ہوا قیامت تک حرام ہے۔"

(اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۸)

● ——— ایک مشہور حدیث جو شیعہ و سنی دونوں علماء نے نقل کی ہے کہ :

آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا :

"اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ"

"آپ (علیؑ) کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔"

یہ اور اسی قسم کی دسیوں دوسری احادیث حضرت محمدؐ کے خاتم النبیینؐ ہونے پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

حضرت محمدؐ کے خاتم النبیینؐ ہونے کے حوالہ سے چند سوالات

اٹھائے جاتے ہیں جن پر توجہ ضروری ہے۔

● —— بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر انبیاء کا بھیجنا خداوند عالم کی جانب سے اپنے بندوں پر ایک فیضِ عظیم ہے تو کیوں دَورِ حاضر کے لوگ اس فیضِ الٰہی سے محروم ہیں؟ کیوں اس دور کے لوگوں کے واسطے کوئی پیغمبر و رہنما نہیں بھیجا جاتا؟

جواب:

جو لوگ اس قسم کا سوال کرتے ہیں وہ درحقیقت ایک اہم نکتہ سے غافل ہیں اور وہ یہ کہ قافلہ انسانیت فکر، شناخت اور آگاہی کے لحاظ سے اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کی روشنی میں از خود آگے بڑھ سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اولوالعزم پیغامبرانِ خدا یعنی وہ انبیاء جو صاحب شریعت صاحب کتاب تھے پانچ ہیں۔

حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

یہ تمام پیغمبرانِ خدا اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق نوعِ بشر کی ہدایت کرتے رہے اور انسانیت کو منزل کمال کی جانب لاتے ہوئے قافلۂ انسانیت کو ایک کے بعد دوسرے اولوالعزم پیغمبر کے حوالہ کرتے رہے یہاں تک کہ یہ قافلہ حضرت محمدؐ کے دور میں منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا اور پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کی روشنی میں اب یہ قافلہ خود راہِ مستقیم پر بڑھنے کے قابل ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر انسانی معاشرہ ایک ایسے فرد کی مانند منزل کمال تک پہنچ چکا ہے کہ جس نے مرحلہ وار اپنے تعلیمی نصاب کو تکمیل تک پہنچایا ہو۔

اور اب وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکا ہو اور اب اسے کسی درس گاہ میں جانے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ خود کتب کے مطالعے کے ذریعہ مشکل علمی مسائل کو حل کر سکتا ہے۔

● —— عالمِ انسانیت کو ہر روز نت نئے مسائل کا سامنا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ اسلام کے جامد اور قدیم قوانین ان نت نئے مسائل میں انسانیت کی رہنمائی کر سکیں؟

جواب:

اسلام دو طرح کے قوانین رکھتا ہے۔

ایک وہ جو انسان کی مخصوص صفات کی مانند ثابت اور برقرار ہیں جیسے توحید پر عقیدہ، اصولِ عدالت کا اجراء اور ہر قسم کے ظلم و تعدی اور ناانصافی کے خلاف صف آرائی وغیرہ۔

لیکن دوسرے وہ کلی اور جامع اصول ہیں جو ہر زمانے میں بدلتے ہوئے حالات اور جدید پیش آمدہ مسائل کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مثلاً اسلام کا ایک اصول کلی "اوفوا بالعقود" (اپنے معاہدوں کی پابندی کرو) ہے۔ اس اصول کی افادیت اور اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ اور تغیرات زمانہ کے باوجود متاثر نہیں ہوگی۔ اور جب بھی مفید اجتماعی، تجارتی اور سیاسی معاہدے ہوں گے اس گرانبہا اصول کو پیش نظر رکھا جاتا رہے گا۔

مثال کے طور پر ایک اور اصولِ کلی کو لیے لیتے ہیں۔

لاضرر ولاضرار فی الاسلام

اس اسلامی اصول کے لحاظ سے نہ تو ضرر اٹھانا چاہیے اور نہ ہی کسی کو ضرر پہنچانا چاہیے۔ اس قانون کو "قاعدہ لاضرر" کا نام دیا گیا ہے۔ اور اس اصول کے تحت ہر قسم کے انفرادی اور اجتماعی قانون کو بناتے وقت اس زریں اصول کو مدنظر رکھا جائے گا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلام کے یہ قواعدِ کلیہ کس طرح ہماری انفرادی و اجتماعی مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں۔ اسلام اس طرح کے بے انتہا قوانین کا حامل ہے کہ جن کو مدّنظر رکھ کر ہم آج بھی اپنی انفرادی و اجتماعی پیچیدہ ترین مشکلات کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

● — بے شک امتِ اسلامی پیش آمدہ مسائل کے حل کے سلسلہ میں ایک رہبر و رہنما کی محتاج ہے۔ لیکن جیسا کہ دورِ حاضر میں پیغمبرؐ ہمارے درمیان موجود نہیں اور ان کے جانشین پردۂ غیب میں ہیں اور عقیدۂ ختمِ نبوت کی رو سے کسی نئے پیغمبر کے آنے کا امکان بھی نہیں تو آیا ایسی صورت میں امتِ اسلامی کو نقصان نہیں پہنچ رہا؟

جواب:

شریعت اسلامی میں اس دور کے مسائل کا بھی حل موجود ہے اور اس دور میں امت کی رہبری و رہنمائی کے لیے "ولایت فقیہ" سے کام لیا گیا ہے۔ اسلام نے ان حالات میں ایسے فقیہ جامع الشرائط کو رہبر و قائد تسلیم کرنے کا حکم دیا ہے جو علم و تقویٰ اور اعلیٰ درجہ کی سیاسی بصیرت رکھتا ہو۔

اس جامع الشرائط رہبر کی شناخت کے لیے بھی اسلام نے کچھ معیار

معین کیے ہیں جن پر ہم آگے چل کر "ولایتِ فقیہ" کی بحث میں مفصل روشنی ڈالیں گے ۔

"ولایتِ فقیہ" دراصل انبیاء اور ان کے اوصیاء کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ فقیہ جامع الشرائط کی رہبری اس بات کی دلیل ہے کہ امتِ اسلامی کو کسی بھی دور میں سرپرست و راہبر و رہنما کے بغیر نہیں چھوڑا گیا۔

سوالات

١ — خاتمیت کا صحیح مفہوم کیا ہے ؟

٢ — ختم نبوت پر قرآن کی کون سی آیات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ؟

٣ — ہمارے زمانے کے لوگ انبیاء کی نعمت سے کیوں محروم ہیں — ؟

٤ — اسلامی قوانین کی کتنی اقسام ہیں اور وہ موجودہ دور کی ضروریات کس طرح پوری کر سکتے ہیں ؟

٥ — آیا ایک اسلامی معاشرہ بغیر رہبر کے رہ سکتا ہے ؟ ہمارے زمانے میں مسئلہ رہبری کس طرح حل کیا جاتا ہے؟

مکتب تشیع اور قرآن
مؤلف: سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی
ناصبی حضرات مسلمانوں کے دیگر فرقوں کے درمیان
مکتب اہلبیت کو بدنام کرنے کی خاطر شیعہ حضرات
پر قرآن سے عدم وابستگی و تحریف کا الزام عائد کرتے
ہیں۔ کتاب ہذا میں اس بے بنیاد الزام کو محکم دلائل
اور اقوالِ علما کی مدد سے رد کیا گیا ہے
اور قرآن سے متعلق مکتب اہلبیت ؑ
کے عقائد کو وضاحت کے ساتھ
بیان کیا گیا ہے
عمدہ کتابت
بہترین طباعت
سفید کاغذ
قیمت ۷ روپے
درس قرآن
قرآن فہمی کے لیے گرانقدر پیشکش
اُستاد شہید
مُرتضیٰ مطہری کی
تفسیرِ قرآن کے موضوع پر
تقاریر کا مجموعہ
جس میں آپ نے
"سورۂ فاتحۃ" "سورۂ بقرۃ"
"سورۂ انشراح" "سورۂ قدر"
"سورۂ زلزال" "سورۂ عادیات" اور
"سورۂ عصر" کی تفسیر کو نہایت دل نشین پیرائے میں بیان کیا ہے
دیدہ زیب سرورق
سفید کاغذ
آفسٹ طباعت
۳۲۸ صفحات
قیمت -/. روپے
دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

ائمہ علیہم السلام کے سیاسی کردار پر
ایک منفرد پیشکش
آمریت کے خلاف
ائمہ طاہرینؑ کی جدوجہد
تصنیف
مولانا سید علی شرف الدین موسوی
جس میں
ائمہؑ کے سیاسی کردار کے اثبات اور ائمہؑ کے اس لائحہ عمل اور طریقہ کار
پر روشنی ڈالی گئی ہے جو آپ نے ہر دور کے آمروں اور طواغیت کے خلاف اختیار کیا
بہترین کتابت
دیدہ زیب سرورق
عمدہ کاغذ
۲۰۰ صفحات
قیمت ۳۰/ روپے
دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان
۲-بی-۴/۵ — ناظم آباد — نمبر ۲ — کراچی

مکتبِ تشیع کے مایہ ناز عالم آیت اللہ علامہ سید عبد الحسین شرف الدین
موسوی اور جامعۃ الازہر مصر کے رئیس جناب شیخ سلیم البشری کے درمیان
مراسلات کے ذریعہ ہونے والے سوال وجواب پر مشتمل معروف کتاب
"المراجعات"
کا
اردو ترجمہ
مذہبِ اہلبیتؑ
جس میں
نہایت شائستہ انداز میں مکتبِ تشیع پر کیے جانے والے اعتراضات
کا جواب دیتے ہوئے آیاتِ قرآنی اور فریقین کے یہاں معتبر احادیثِ رسولؐ
کی روشنی میں مکتبِ تشیع کی حقانیت کو ثابت کیا گیا ہے
عمدہ کتابت
اعلیٰ طباعت
قیمت ۷۰ روپے
دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان
۲-بے - ۴/۵ — ناظم آباد — نمبر ۲ — کراچی